

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچویں ششماہی تین دہائی

ہندوستان سے باہر ہونے والے چندہ آئندہ پانچویں ششماہی

نگار

چوبہ اضافہ قیمت و قیمت شامل نہ ہوگا

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر

جلد ۳۶	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۹ء	نمبر ۶
--------	--------------------------	--------

۲	ملاحظات	
۶	تلاذہ مصحفی	مختار الدین آرزو
۲۰	لہاشی اور موسیقی عہد قدیم میں	
۲۶	مطالعہ لغت	ل۔ احمد
۳۶	معراج تمدن	رام
۴۱	عربی زبان اور ادب کی مختصر تاریخ	جلیل الرحمن عظمیٰ
۴۶	اٹلی کی غیر جانبداری اور روس کی طرفداری کا راز	
۵۰	فردوس ارضی	
۵۴	مکتوبات نیاز	
۵۹	باب الاستفسار	
۶۴	کیا آپ کو معلوم ہے؟	
۶۹	تنوعات	
۷۱	مطبوعات موصولہ	
۷۷	منظومات	ماہر القادری - صبا - جگر

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳۶	دسمبر ۱۹۶۹ء	شمار ۶
--------	-------------	--------

ملاحظات

سخنہائے گفتنی

اس اشاعت کے ساتھ نگار کا اٹھارواں سال ختم ہوتا ہے اور جب میں غور کرتا ہوں کہ اس مدت میں ایک بار بھی مجھے تاخیر اشاعت پر معذرت خواہی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہو سکا۔ ہندوستان میں کسانوں کے بعد سب سے زیادہ تباہ حال طبقہ اردو جرائد و رسائل کے مدیروں کا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس تباہ حالی کا سبب مشترک شاید یہ ہو کہ وہ تغذیہ جسم کا سامان فراہم کرتا ہے اور یہ تغذیہ روح کا۔ بہر حال سبب یہ ہونا کوئی اور حقیقت ہے کہ ہماری صحافت مہذب گداگری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور گداگری بھی ایک ایسے کاسہ گدائی کے ساتھ جس کے ٹوٹ جانے کے لئے ذرا سی ٹھٹیس کی ضرورت ہے۔

اس لئے یہاں مشکل ہی سے کوئی سخت جان رسالہ یا اخبار ایسا نظر آئے گا جو چند سال سے زیادہ زندگی پائے در نہ اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ یہ درود حد سے گزر کر دوا ہو گیا اور رسالہ یا اخبار ہمیشہ کے لئے ختم ! اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہماری صحافت کا معیار اس قدر پست و ادنیٰ ہے کہ ہر طفل دبستان اڈیٹر بن سکتا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ خود پبلک کسی معیاری رسالہ کی قدر شناس نہیں۔ اس لئے پست وادنی رسالے تو اس لئے بند ہو جاتے ہیں کہ وہ پست وادنی ہیں اور اچھے رسالے اس لئے زندہ نہیں رہتے کہ وہ اچھے ہیں پس ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں اور ایسی پبلک کے درمیان جہاں اچھے اور بُرے کا امتیاز کوئی معنی نہ رکھتا ہو کسی رسالہ کا اتنے عرصہ تک زندہ رہنا معجزہ سے کم نہیں، لیکن جس وقت آپ "نگار" کی تاریخ پر غور کریں گے تو اس کی زندگی معجزہ سے کچھ بلند تر چیز نظر آئے گی

اس وقت ہندوستان میں جتنے رسائل پندرہ بیس سال یا اس سے زائد عمر کے نظر آتے ہیں ان کی بقا کاراز یہ ہے کہ یا تو وہ کسی سرمایہ دار ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں یا خود ان کا اڈیٹر دولت مند ہونے کی وجہ سے نفع یا نقصان کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نگار کو ان دونوں میں سے کوئی چیز حاصل نہیں۔ نہ وہ کسی ادارہ سے تعلق رکھتا ہے اور نہ اس کا اڈیٹر اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ اس بار کو برداشت کر سکے۔ اور اسی لئے میں نے کہا کہ نگار کی زندگی معجزہ سے بھی زیادہ کوئی اور چیز ہے جسے عام لوگ "فضل خداوندی" کہہ سکتے ہیں، لیکن میری زبان میں اس کا نام "حسن تدبیر" ہے ۲۲ء سے اس وقت تک کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً ۲۰ ہزار صفحات میں سے کم و بیش آٹھ ہزار صفحات صرف میرے قلم کے ہیں اور اس طرح گویا ادارت کے تقریباً نصف مصارف خود میں نے یا میرے دماغ نے برداشت کئے اور ایک دن کے لئے بھی معاون کی خدمات حاصل نہیں کیں۔ یہ تو ہوا شعبہ ادارت کا حال، اب رہ گیا انتظامی شعبہ سو اس کو بھی ابتدائی چند سالوں تک میں نے ہی سنبھالا اور اس کے بعد سوائے ایک شخص کے جس کی تنخواہ ایک معمولی کلرک سے زیادہ نہیں ہے کسی اور کا اضافہ نہیں کیا گیا

اس میں شک نہیں کہ پبلک نے نگار کی قدر کی، لیکن اس قدر شناسی کی حد اس سے آگے کبھی نہ بڑھی کہ میں صرف مزدوروں کی طرح کام کر کے نگار اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہو سکا۔ لیکن اب کہ میں عناصر میں اعتدال کی کمی اور قواء میں اضمحلال کی زیادتی بین طور پر محسوس کرنے لگا ہوں، یہ سوچنا ناگزیر ہو گیا ہے کہ میں اس محنت کو کب تک برداشت کر سکوں گا، اور غالباً اس باب میں آپ کو مجھ سے زیادہ سوچنا چاہئے

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کوئی "مردِ راہب" نہیں ہوں، زندگی کے تمام وہ تعلقات جنہیں "دنیا" سے تعبیر کیا جاتا ہے، میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں اور میں اُن سے بے نیاز ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ ابتداء سے میں جس معاشرت کا عادی ہوں وہ بھی معمولی سطح سے کچھ بلند ہے، اس لئے نگار کی زندگی کے ساتھ میری ضرورت زندگی کا سوال بھی آپ کے سامنے ہونا چاہئے

پھر یہ مسئلہ نہ فراہمی دولت کا ہے، نہ کسی کے لئے اسباب عیش و نشاط فراہم کرنے کا، بلکہ صرف یہ کہ اگر واقعی نگار نے اس وقت تک کوئی مفید خدمت انجام دی ہے تو مجھے اس کا معاوضہ کم از کم اتنا ضرور ملنا چاہئے کہ میں اسے

نزدہ رکھ سکوں اور انھیں خصوصیات کے ساتھ جو اس وقت تک اسے حاصل رہی ہیں
کاروباری سلسلہ میں اس وقت تک میں نے قارئین نگار کو کبھی اس قدر اہتمام کے ساتھ مخاطب نہیں کیا اور
شاید اب بھی اسے گوارا نہ کرتا، اگر حالات مجبور نہ کرتے۔ جنگ نے کاغذ و طباعت کے مصارف دو چندان کر دیے ہیں جو
صرف آپ ہی کی قوبہ سے پورے ہو سکتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ:-

آپ اپنی خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے، ساتھ ہی ساتھ کم از کم ایک
خریدار اور پیدا کیجئے۔ انفرادی طور پر آپ کی یہ کوشش بہت معمولی بات ہے لیکن
اجتماعی طور پر اس کا جو اثر پڑے گا وہ بڑی اہم چیز ہے جو میری بہت سی فکر وں کو دور
کر دیگا اور آئندہ زیادہ اطمینان کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقعہ دے گا۔

جنگ کا فیصلہ اسٹالین کے ہاتھ میں ہے

جنگ جس انداز و رفتار سے جاری ہے وہ لوگوں کے لئے بہت مایوس کن ہے۔ ”مایوس کن“ اس لئے کہ دنیا
تو یہ چاہتی ہے کہ روز قتل و غارتگری کی داستانیں سننے میں آئیں، ہلاکت و خونریزی کے ہولناک واقعات رونما ہوں،
اخباروں میں یہ خبریں نظر آئیں کہ جرمنی نے پیرس و لندن پر اور اتحادیوں نے برلن پر ہوائی تاخت شروع کر دی،
لیکن وہاں یہ حال ہے کہ نہ نازی فوج آگے بڑھتی ہے نہ اتحادی افواج کوئی جارحانہ اقدام شروع کرتی ہیں
یقیناً موجودہ حالات جنگ بہت غیر دلچسپ ہیں اور اگر ان جہازوں کی غرقابی کو نظر انداز کر دیا جائے جو جزیرہ
انگلستان کے قرب و جوار میں جرمن آبدوزوں اور سرنگوں کی وجہ سے سننے میں آتی رہتی ہے تو ہم کو یہ سمجھنے کا موقعہ بھی
نہیں ملتا کہ واقعی جنگ جاری بھی ہے یا نہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سکوں کی تہ میں کتنا اضطراب پنہاں
ہے اور فضا کی یہ خاموشی کتنے زبردست طوفان کا اعلان ہے

گزشتہ جنگ عظیم چاہے کتنی ہی ہولناک رہی ہو، لیکن اتنی پیچیدہ نہ تھی۔ اس میں کھلے ہوئے فریق تھے،
کھلے ہوئے مقاصد تھے، اور کھلی ہوئی لڑائیاں ہو رہی تھیں، لیکن اس جنگ میں تو ابھی تک یہی پتہ نہیں چلا کہ کون
کس کا ساتھ دے گا اور جنگ کی مرکزی حیثیت کس حصہ زمین کو حاصل ہوگی

اس جنگ کو جس ملک نے معمر بنا رکھا ہے وہ روس ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا آئندہ طرز عمل جنگ

کے نقشے میں کیا تبدیلیاں پیدا کرنے والا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے روس کی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے جسوقت زیکو سلوویکیا کا مسئلہ طے کرنے کے لئے میونخ کانفرنس میں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اطالیہ کے نمائندے جمع ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ روس کی نمائندگی ضروری ہے یا نہیں (خاص کر ایسی صورت میں جبکہ روس اور زیکو سلوویکیا کے درمیان معاہدہ اتحاد و تعاون ہو چکا تھا) اس پر جرمنی و اطالیہ کے نمائندوں نے کہا کہ ہم روسی نمائندوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی گوارا نہ کریں گے، فرانس و برطانیہ یہ سن کر خاموش ہو رہے اور انھوں نے بھی روس کی شرکت کو غیر ضروری سمجھ کر زیکو سلوویکیا کی موت کا فیصلہ صادر کر دیا

اس توہین نے روس کی آنکھیں کھول دیں اور ایک عام جوش و ہاں پیدا ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کو جو اس سے قبل نکال دیے گئے تھے اور جن کے نکل جانے کی وجہ سے سوویت حکومت کا اقتدار ضعیف ہو گیا تھا پھر بلا بلا کر ذمہ داری کی جگہیں دی گئیں اور نئی پالیسی متعین کرنے پر غور ہونے لگا۔ اسی دوران میں ہٹلر نے زیکو سلوویکیا و میمل پر قبضہ کر لیا جس نے سارے یورپ میں بحینی پیدا کر دی اور فرانس و برطانیہ پوری طرح محسوس کرنے لگے کہ اب پولینڈ کی بھی خیر نہیں ہے۔

اس وقت فرانس و برطانیہ کی حالت ایک ڈوبنے والے کی سی تھی جو تنکے کا سہارا بھی بہت سمجھتا ہے اور انھوں نے اسی سوویت حکومت سے اعانت چاہی جسے چند دن قبل میونخ کانفرنس میں وہ اس قدر ذلیل کر چکے تھے۔ خود پولینڈ بھی سوویت حکومت کا مخالف اور جرمنی کا طرفدار تھا، لیکن مجبوراً اسے بھی روس کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا

یہ رنگ دیکھ کر جرمنی و اطالیہ بھی چوکنا ہوئے اور ٹھیک اس وقت جبکہ برطانیہ و فرانس اور روس کے درمیان فوجی اتحاد پر گفتگو ہو رہی تھی، انھوں نے روس کے ساتھ ساز باز شروع کر دی اور جو اتحاد فرانس و برطانیہ کے ساتھ ہونے والا تھا وہ جرمنی کے ساتھ ہو گیا

اس واقعہ کو لوگ ہٹلر کا معجزہ کہتے ہیں، لیکن اس میں معجزہ کی کوئی بات نہیں، جو روس کی اندرونی پالیسی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ روس کے لئے کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہ تھا کہ وہ جرمنی کا ساتھ دے اور اس سے پہلے ہی اس نے کبھی جرمنی کے خلاف فرانس و برطانیہ سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی

روس کے لئے سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ جاپان اور جرمنی میں اتحاد پیدا ہو جائے، کیونکہ اس صورت میں اس کے مشرقی و مغربی حصے دونوں بیک وقت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں اسی لئے وہ جرمنی سے بگاڑ کر کے جاپان کے خطرہ کو اپنے لئے اور زیادہ مہلک نہیں بنا سکتا تھا اور اس نے اتحاد بین کے مقابلہ میں جرمنی کے ساتھ معاہدہ کرنا مناسب سمجھا، علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ فوجی و جنگی نقطہ نظر سے روس، برطانیہ

اور فرانس دونوں کو کمزور سمجھتا ہے اور جرمنی کو مضبوط۔ اسے یقین ہے کہ فرانس و برطانیہ سے اتحاد کرنے کے باوجود وہ جرمنی سے مقابلہ کر کے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اس یقین کے لئے وہ وجہ بھی رکھتا ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں جب برطانیہ و فرانس کی فوجوں پر جرمن افواج کا دباؤ پڑتا تھا تو فرانس و برطانیہ روس سے درخواست کرتے تھے کہ مشرقی محاذ پر حملہ کر کے اس دباؤ کو ہٹا کر دے اور اگر کبھی روس ایسا کرنے سے قاصر رہتا تھا تو اسے دھکی دیکاتی تھی کہ ذخیرہ حرب بھیجنا بند کر دیا جائے گا، لیکن برخلاف اس کے جب روس کی طرف جرمن افواج کا دباؤ ہوتا تھا تو برطانیہ و فرانس کی فوجیں کبھی اس کی پرواہ نہ کرتی تھیں

اس مرتبہ بھی روس نے یہی خیال کیا کہ اگر جرمنی نے اس پر حملہ کر دیا تو فرانس و برطانیہ اس کی کوئی مدد نہ کریں گے، رہ گئے فرانس و برطانیہ سوان کے روس پر حملہ کر دینے کی کوئی صورت ہی نہیں کہ اس کا اندیشہ اس کو پیدا ہوتا۔ الغرض روس کا جرمنی کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا کوئی حیرتناک بات نہیں، بلکہ نتیجہ ہے اس کے اُن تلخ تجربات کا جو گزشتہ جنگ عظیم میں اسے حاصل ہوئے تھے۔ رہا یہ سوال کہ بالشویٹ و نازیت کا تضاد کیونکر اس اتحاد کو گوارا کر سکتا تھا سو اس کے متعلق یہ کہہ دینا غالباً کافی ہو گا کہ اسٹالین کی ڈپلومیسی اب سخت مادی قسم کی ڈپلومیسی ہے جس کا تعلق ”جذبات“ سے بہت کم ہے اور وہ اسے تو گوارا کر سکتا ہے کہ اشتراکیت کو تھوڑا سا صدمہ پہنچ جائے لیکن وہ جرمن ایسی قومی حکومت کو جو بالکل اس کی سرحد پر واقع ہے اپنا دشمن بنائے، ممکن نہیں

الغرض روس و جرمن کا اتحاد پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی بات تھی اور اب یہ اتحاد یا تو اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب جاپان کی طرف سے روس کو بالکل اطمینان ہو جائے (اور اس کی کوئی امید نہیں) یا پھر یہ کہ نازی حکومت ختم ہو کر، جرمنی میں بالشویٹ کا دور دورہ ہو جائے (اور اس کا امکان ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ جنگ کا اختتام کیونکر ہو گا اور پولینڈ کا مسئلہ کیونکر سلجھے گا

اگر جنگ کا اختتام اس فیصلہ پر ہوتا ہے کہ پولینڈ کی حکومت کو جوں کا توں پھر بحال کر دیا جائے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ مان لیں کہ جرمنی اپنے مفتوحہ حصہ کو واپس کر دینے کے لئے راضی ہو جائے گا، تو بھی روس سے سمجھوتے کا کیا امکان ہے؟ کیا وہ پولینڈ کے مشرقی علاقہ کو واپس کر دے گا اور کیا بحیرہ بالٹک پر جو اقتدار اس نے قائم کر لیا ہے اسے اپنے ہاتھ سے دیدیگا۔ یقیناً اس کی کوئی امید نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سوائے جرمنی کے اس پر حملہ کرنے کی بہت کسی میں نہیں ہے اور جرمنی، روس سے بگاڑ کر کے اپنی ہیبت کو کم نہیں کر سکتا

روس و جرمنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کی صحیح نوعیت کا علم کسی کو نہیں لیکن یقینی ہے کہ جس حد تک خام پیداوار کا تعلق ہے، روس اس کی مدد ضرور کرے گا، رگبی فوجی اعانت، سو اس کا امکان فی الحال تو نہیں ہے لیکن جس وقت روس ریاستہاے بالٹک کی طرف سے مطمئن ہو گیا اور فن لینڈ بھی اس کے زیر اثر آ گیا، اس وقت

امکان ہے کہ وہ جرمنی کو زیادہ ٹھوس مدد دے اور یہی وہ وقت ہے جس کا سب کو انتظار ہے اور وہ انہیں چکتا
لیکن اگر کسی وجہ سے روس نے جرمنی کی فوجی مدد نہ کی اور یہ جنگ ایک سال تک اسی طرح قائم رہی تو ہٹلر
کا ناکام رہنا یقینی ہے اور پھر نہیں کہا جاسکتا کہ اُس وقت جرمنی میں دوبارہ دورِ ملوکیت کا اعادہ ہو گا یا بالشویت کا سیلاب
جرمنی و فرانس بلکہ سارے وسطیورپ سے گزر کر سواحل انگلستان سے ٹکراتا ہوا نظر آئے گا

جنگ کی اس متذبذب حالت کو دیکھ کر بعض سیاسی مفکرین کے دماغ میں ضرور یہ باتیں آتی ہوں گی کہ:
اگر ایک سال قبل مسٹر چمبرلین اور مسٹر بانٹ (Bonnet) اہل زیگ کی ہمت نہ توڑتے۔۔۔۔۔
اگر مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر کے ہر ہٹلر کو آسٹریا لینے کا موقع نہ دیا ہوتا۔۔۔۔۔
اگر بجائے مسٹر ولیم اسٹریٹنگ (W. Strang) لارڈ ہیلی فاکس ماسکوریو
کئے جاتے۔۔۔۔۔

اگر پولینڈ کو ذخیرہٴ حرب خریدنے کی اجازت دیدی جاتی۔۔۔۔۔ اور
اگر مسٹر چمبرلین کے مشیروں میں مسٹر چرچیل ایسے قوی عزم دار وہ کے لوگ شامل ہوتے۔۔۔۔۔ تو شاید
نتیجہ یہ نہ نکلتا۔ لیکن یہ تمام باتیں ”مشت بعد از جنگ“ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس وقت صرف یہ سوچنا ہے کہ اگر
روس بھی اپنی ۴۰ لاکھ مسلح فوج کے ساتھ جرمنی کا شریک ہو گیا تو کیا ہو گا؟
اگر برطانیہ نے ابھی تک اس مسئلہ پر غور نہیں کیا تو اب پوری طرح غور کر لینا چاہئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر
خدا نخواستہ جنگ نے یہ نازک صورت اختیار کر لی تو پھر اس کی دھاک اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب وہ اپنے تمام
مقبوضات کی آبادی کا دل اپنے ہاتھ میں لیے اور وعدہ و وعید کی اس پالیسی کو ترک کر دے جس پر اعتماد کرنے کی
ہمت اب کسی میں باقی نہیں

جنگ و ہندوستان کا مستقبل

جنگ، ”عالم کون و فساد“ کا بہترین مظہر ہو ا کرتی ہے، جس میں خدا جانے کتنے بگڑتے ہیں اور کتنے بنتے ہیں اور
اس لئے ہر قوم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ہندوستان جو باوجود ۳۵ کروڑ آبادی رکھنے کے
اب تک مستعمراتی آزادی کی منزل تک بھی نہیں پہنچ سکا یعنی نہ پچھلی جنگ سے وہ کوئی فائدہ اٹھا سکا اور نہ اس جنگ سے
وہ کوئی توقع قائم کر سکتا ہے

ہندوستان نے پچھلی لڑائی میں کیا کچھ نہیں کیا، لیکن برائے نام صوبہ جاتی آزادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا

اور اب موجودہ جنگ میں بھی وہ ہر قربانی کے لئے طیار ہے، لیکن اس کے اعتراف میں برطانوی حکومت صاف صاف یہ بتانے کے لئے بھی طیار نہیں کہ اغراض و نتائج جنگ سے ہندوستان کا کیا اور کتنا تعلق ہے۔
 اول اول جب دیرائے ہندوستان کے لیڈروں سے گفتگو کر رہے تھے تو امید کی جھلک پائی جاتی تھی، لیکن اب کہ احتجاجاً کانگریس وزارتوں نے استعفا دیدیا ہے، یہ سوال سامنے ہے کہ اگر واقعی برطانوی حکومت نے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ کی تو کانگریس کا آئندہ طرز عمل کیا ہوگا۔ حال ہی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس الہ آباد میں ہوا تھا، جس میں اس نے اپنے آئندہ اقدامات کا ذکر تو نہیں کیا، لیکن ایک بار اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ

”برطانوی حکومت کے سامراجی انداز کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے اور اس کے

باشندوں کو کانسیٹی ٹیوٹ اسبلی (مجلس خود مختار) کے ذریعہ اپنا نظام حکومت خود بنانے کا حق تسلیم کیا جائے۔“

اقلیتوں کے تحفظ کے متعلق یہ اسمبلی ایسا نظام مرتب کرے گی جس کی رو سے انھیں پوری طرح اطمینان دلا دیا جائے گا اور اگر اقلیتوں کے حقوق کے معاملات پر باہمی اتفاق نہ ہو تو انھیں ثالثی کے ذریعہ سے طے کیا جائے گا۔

اسی کے ساتھ ورکنگ کمیٹی نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اگر حکومت نے گفت و شنید کا دروازہ بند کر دیا اور ہندوستان

کے مطالبہ آزادی کو ٹھکرا دیا گیا تو وہ عدم تعاون کرے گی اور حکومت کا ساتھ دینے سے بالکل انکار کر دے گی۔

ورکنگ کمیٹی کے اس رزلوشن کا حکومت پر کیا اثر ہوگا، اس پر حکم لگانا قبل از وقت ہے، لیکن یہ قرین قیاس ہے کہ ۱۸ دسمبر تک (جو ورکنگ کمیٹی کے دوسرے اجلاس کی تاریخ ہے) کوئی نہ کوئی بیان حکومت کی طرف سے ضرور شائع ہوگا اور اس کے الفاظ کچھ ایسے سچیدہ ہوں گے کہ ان سے پھر کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہ ہو سکیگا اور کانگریس کو لائحہ عمل کوئی نہ کوئی آخری فیصلہ اس باب میں کرنا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس کا اثر ان کانگریسی ہندوؤں کی وجہ سے جو مہا سبھائی ذہنیت رکھتے ہیں، مسلمانوں پر بہت کم رہ گیا ہو اور خود کانگریس کے اندر بھی دو جماعتیں مختلف خیال پیدا ہو گئی ہیں، لیکن آزادی ملک کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سب کو اتفاق ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اختلافات کا اثر اس پر بھی پڑے۔ مسلم لیگ بھی اپنا نصب العین ہندوستان کی آزادی ظاہر کر چکی ہے اور کانگریس بھی، اس لئے کسی ایک مقصد پر متحد ہو جانے کے بعد اس کے حصول کے ذرائع پر اتنا اختلاف نہ ہونا چاہئے کہ اصل مدعا ہاتھ سے جاتا رہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت صورت کچھ ایسی ہی پیدا ہو گئی ہے جس سے حکومت فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور کسی قسم کی رواداری سے کام لینے کے لئے آمادہ نہیں اور اس باب میں جنگ کی موجودہ رفتار بھی بہت کچھ حکومت کی معاون ہے۔

اگر جنگ نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی اور ہندوستان پر بھی براہ راست اسکا اثر پڑا، تو یقیناً حکومت کو اپنی موجودہ پالیسی میں تبدیلی کرنا پڑے گی، لیکن یہ صورت پھر وہی سودا کرنے کی ہو جائے گی، جہر حکومت اس وقت ناگ بھول چڑھاتی ہے۔ اس لئے دشمنی کا اقتضا یہی ہے کہ خطرہ آنے سے پہلے ہی اس کے مقابلہ کا انتظام کر لیا جائے اور اسکی صورت صرف یہ ہے کہ حکومت اپنی پالیسی کا اعلان کرے اور ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو تعویق میں ڈال کر لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع نہ دے کہ برطانوی ڈاکٹر سی اور جبرمن نازیوں کی حقیقت ایک ہی چیز ہیں۔

تلاذہ مصحفی

(مسلل)

”م“

(۸۲) مائل، یہ اصل میں میر غلام علی حسرت بریلوی کے شاگرد رشید تھے مصحفی جس زمانہ میں لکھنؤ میں اقامت گزری تھے اسی زمانہ میں اکثر غزلیں احتیاطاً ان سے دکھلائیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اس دم کو دیکھ آئینہ حیران رہ گیا سنبل بھی دیکھ زلف پریشان رہ گیا
سب ہم صغیر منزل مقصود کو گئے میں پاشکستہ بے سرو سامان رہ گیا
وہ اک آن میں آن کر توڑتا ہے، تصور جو ہم سا ہا باندھتے ہیں

(۸۳) مخلوق تخلص، سید احسان حسن نام خلف میر حسن مرحوم، شعرو شاعری ان کی خاندانی چیز تھی یہی وجہ ہے کہ نوعمری ہی میں اچھے اشعار کہنے لگے تھے، ابتداء ایام میں اپنا کلام اپنے بڑے بھائی کو دکھاتے رہے، جب فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے تو مصحفی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اس کے آنے تک سنبل جادوے پھر بلا سے جو دم نکل جادوے
شمع اس سے کرے جو دعویٰ حسن، یارب اس کی زبان جل جادوے،
واسع حسرت قفس سے باغ میں ہم چھٹ کے تب آئے جب خزاں آئی
یو چھاتب اس نے حال دل میرا جب زباں میں رہی نہ گویائی،
دیکھتا ہوں اسے تو کہتا ہے کتنا ہشیار ہے یہ سودائی

(۸۴) مخمور تخلص، محمد جعفر نام ولد خواجہ محمد علی سرور (شاگرد استش) ان کے لڑکے تھے، آباد اجلا دلا پور کے رہنے والے تھے اور خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں عطاری کا پیشہ کرتے رہے، منور خاں غافل (تمیند مصحفی)

کی معرفت مصحفی مرحوم کی خدمت میں آئے اور شاگرد ہوئے، صاحب دیوان تھے، دیوان غالباً لکھنؤ میں موجود ہے دیوان کا قلمی نسخہ جناب حسرت موہانی کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے انتخاب غزلیات بھی شایع کیا ہے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

ہتکڑی ہاتھوں کی ٹوٹی پاؤں کی بچیر بھی اس قدر جوش جنوں میں ہم نے مائے ہاتھ پاؤں
دست رنگیں وہ دکھاتا ہے میں جب کہتا ہوں قتل کرنے سے مرے آپ کو کیا ہاتھ لگا
ایک دم بیکار یہ دست جنوں رہتا نہیں بھاڑے دامن کو اگر یاد گریاں بھول جائے
مہجڑہ وادی مجنوں میں یہ دیکھا کہ وہاں ہر شجر سے "انا لیلیٰ" کی صدا آتی ہے
ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:-
پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

(۸۵) مست تخلص محمد قاسم نام قوم کے بھان، بہت وجہ، شجاع و خوش وضع آدمی تھے، آخر عمر میں لباس گروہی پہنا کرتے تھے، اغیار سے میل جول بالکل بند کر دی تھی، فن موسیقی میں یگانہ عصر تھے، ان کے صرف تین شعر ملے ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں:-

دکھاؤں تجھے ایک نقشہ مصور رہے گر ترا ہوش ہر جا مصور
نہ کر دھیان نازک خیالی کا اس کی لیا ہے تجھے دہم نے کیا مصور
جو کھینچے گا تصویر تو اس پری کی تو ہو جائے گا تجھ کو سودا مصور

(۸۶) مسرور تخلص، شیخ بیر بخش نام خلعت حکیم حیات، اللہ قلاش قصبہ کا کوڑی کے رہنے والے حکیم خیر اللہ کے نواسے تھے، لکھنؤ میں تربیت پائی وہیں علم طب پڑھا، ابتدائے سن بلوغ ہی سے انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، لیکن جو کچھ کہتے کسی کو دکھاتے نہیں وہ اسی فکر میں تھے کہ اتفاق سے سن ۱۲۲۷ھ میں مصحفی مرحوم سے ملاقات ہو گئی انھیں سے مشورہ سخن کرنے لگے، مصحفی لکھتے ہیں:-

"علا کہ مشق ابد و اندوہ سال رسیدہ وضع مؤنث در ریختہ احیائے دل مرگاہ می کند و دیدنی

از معاصرین خوش پائے کمی نہ آرد شیریں گفتاریش تک بر جراح عشق با ز اہل می باشد

فساخ لکھتے ہیں کہ صاحب دیوان گزر رہے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

دیکھ لو آتا ہے کس انداز سے کافر مرا نیشہ مے بہ بغل میں اور ساغر ہاتھ میں

کہتی ہے یہ ہر وقت مجھے آبلہ پائی
 آگے کو قدم دشت مغیلاں سے نہ اُٹھے
 ہوا پنہاں جو اس کا چہرہ پر نور آنکھوں سے
 یہاں تک روئے عاشق ہو گئے مجبور آنکھوں سے
 سدا چشم تصور سے ہم اسکو دیکھ لیتے ہیں
 وہ دل سے ہی بہت نزدیک گو ہے دور آنکھوں سے
 کوئی دیتا ہی نہیں گور غریباں سے جواب
 روز ہم جا کے عزیزوں کو پکار آتے ہیں
 آرزو ہے کہ تری بزم میں اک دم ساتی
 لڑکھڑا کر میں گروں اور تو سنبھالے مجھکو
 اے جنوں کرنے دے آرام مغیلاں کے تلے
 رنج دیتے ہیں بہت پاؤں کے چھالے مجھکو
 اپنے بیگانے ہوئے بیزار تیرے واسطے
 یہ ستم ہم نے اٹھایا یا تیرے واسطے
 یہ فیض مصحفی ہے کہ مسرور ان دنوں
 ہر سمت غلغلہ ہے تری واہ واہ کا

(۸۷) مضطر تخلص، کرپا دیال عرف لالہ کنور سین سپردیہی پر شاد قوم کا ایسٹہ سکسینہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی تقریباً ۱۲ سال تک ڈبائی میں جو متعلقات بلند شہر سے ہے تحصیلاری کا کام کرتے رہے، شعر و شاعری کا ذوق نہیں بچپن ہی سے تھا، جب مکتب میں پڑھتے تھے اسی وقت سے فارسی اور اردو کی چیزیں موزوں کرتے تھے لیکن شرم سے کسی سے نہ کہتے تھے یہاں تک کہ اپنے بزرگوں سے بھی چھپاتے رہے، کچھ دنوں کے بعد محمد عیسیٰ تنہا کے ساتھ مصحفی کے پاس آئے اور ان کے شاگرد ہوئے، طبیعت میں بیدار وانی تھی لیکن عروض، طرز شعر اور محاورہ زبان نہ جاننے کی وجہ سے معذور تھے، صاحب گلشن بنجار فرماتے ہیں:-

”شعرش از اندازہ افروغ تراست و مضمون انکسار قراذال دارد قصیدہ در واقعہ کر بلا نوشتہ اور سہیت ازاں بر مہج خواندہ بود معلوم می شد کہ مضامین منقول یافتہ باشد“

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

سیکھ کر باغ میں قد سے ترے رعنائی کو
 کام خرمانی لگا سر و بھی مرزائی کو
 دشمن اپنا ہمیں تم سمجھو ہوا و غیر کو دوست
 ہم نے بس دیکھ لیا آپ کی دانائی کو
 جب سے اس شوخ کا عاشق میں ہوا ہوں مضطر
 ہر کوئی دیکھ رہے ہے مری رسوائی کو
 سوز جگر کو دیدہ پر ہم کو دیکھئے
 ان آفتوں کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے
 خلل انداز وفا کون سا غماز ہوا
 کہ جواب خط مضطر قلم انداز ہوا

(۸۸) مظلوم تخلص غلام حسین نام معروف بہ مظلوم شاہ، باشندہ پنجاب، بہت دنوں تک لکھنؤ میں رہے، آخر ایام میں الہ آباد میں سکونت اختیار کی۔

نظر افگن ہے کس کے عارض پر نور پر بجلی
کس ہے قصد گہنے کا چراغ طور پر بجلی
چلاتا ہوں از بس میں شب بھر میں مظلوم
دم بند کیا ہے مرے نالوں نے عسس کا
سامنے آتا ہے جب موے میاں کا مضمون
مگر شاہد نظر رہ چمک جاتی ہے

(۸۹) مفتون تخلص، نواب فصیح اللہ خاں نام، خلف نواب نصر اللہ خاں، جس زمانہ میں ان کا قیام رامپور میں تھا احمد خاں غفلت کے شاگردوں میں تھے، لکھنؤ آنے کے بعد مصحفی کے پاس آئے اور ان کے شاگرد ہوئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

مفتون کے تئیں دیکھ کہا میں نے جو تو آج
غمگیں ہے کیا تھکوتا یا ہے کسی نے
تو بھر کے وہ اک آہ لگا کہنے کہ مت پوچھ
دل لیکے ہمیں دل سے بھلا یا ہو کسی نے
وہ کیفیت نہ دیکھی میں چمن کی آب جاری میں
نظر جو لطف آیا چشم تر کی آبیاری میں
ترے مفتون کا جو دن آہ و نالہ میں گزرتا ہے
کچھ ہے رات اسے رشک قمر آخر شماری میں

(۹۰) مفتون تخلص سید محمد رضا نام، متوطن بلگرام مقیم آہ، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شوق سخن کیا کرتے تھے فارسی میں رفعا اور اردو میں مفتون تخلص کرتے تھے دیوان درد اور تھک گنجینہ محبت ان سے یادگار ہیں، فارسی میں قتیل سے اور اردو میں مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے، آخر عمر میں آہ آکر مستقل اقامت اختیار کر لی تھی اور وہیں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

گر کرے زیب گلو وہ نوجوان سبز رنگ
فیض رنگ سب سے تسبیح مر جاں سبز ہو
ماہر و میں نے کہا تم کو تو عالم نے کہا
میر ہی کہنے سے صاحب عرش کے تلمی ہوئے
ناصر نہ نہیں گئے لب نوشیں کی قسم ہے
خیریں سخنی تیری ہمارے لئے سم ہے

(۹۱) مفتون تخلص، مرزا ابراہیم بیگ نام ولد مرزا محمد علی، بزرگوں کا مولد اصفہان تھا لیکن انھوں نے شاہجہاں آباد میں نشوونما پائی، انشا پر داری میں کمال رکھتے تھے، اشعار بہت کم کہا کرتے تھے اور جہتہ مصحفی کے علاوہ کسی کو نہ دکھاتے مصحفی سے انھیں تلمذ تھا خود لکھتے ہیں:-

مفتون مصحفی سے ہوا ہے مجھے فیض،
حق دیر گاہ جگ میں رکھے اسکی ذات کو

مصحفی کے شاگرد ہونے کے علاوہ مقتول ان کے بڑے گہرے دوست بھی تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

مطلب رہا نہ کچھ ہمیں دیرو حرم کے ساتھ	ان کا ہے دل اک ایسے ہی کافر صنم کے ساتھ
رنگ شفق کی خاک میں مل جائے سب بہار	جس دم وہ کھولے اپنے حنا بستہ بات کو
یا تو ہم اس سے آٹھ پہر ہم کلام تھے	یا اب غضب ہے یہ کہ ترستے ہیں بات کو
میں یاں خون رو یا ہوں ہاتھوں سے لگے	جو پاؤں میں ان کے حنا باندھتے ہیں

(۹۲) منتظر تخلص میاں نورالاسلام نام ولد شاہ فیض علی عروت پیر غلام، عربی صرف و نحو تک پڑھی تھی، ہاں درسیات نظم و نثر فارسی اکثر ختم تھیں، ۱۲ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے، بعد کو مصحفی کے شاگرد ہوئے ان کی ذہانت طبع کو دیکھ کر اکثر حضرات نے چاہا کہ میرے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو جائیں، لیکن انھوں نے بالکل التفات نہ کی، ان کے بارے میں مصحفی کی رائے سنئے لکھتے ہیں:-

”کلامش از غایت لطافت و صفائے کلام مولف در پایہ کمی نیست“

صاحب دیوان گزرے ہیں ان کا دیوان قلمی کتب خانہ ندوہ (لکھنؤ) میں موجود ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

سردم خیال یار جو پیش نظر رہا	ہجران میں بھی وصال ہمیں بیشتر رہا
طرف چمن نہ جانے سوئے لالہ زار دیکھ	تو آپ باغ حسن ہے اپنی بہار دیکھ
یک سر مونہ یہ حال دل ابتر سمجھے	زلف سے تیری خدا او بت کافر سمجھے
کس کی توجہ میں تھا غور شدید	شام کو جو گیا سحر آیا
گہر وہ فاش نالہ نے گم آہ نے کیا	رسوائے خلق ہم کو تری چاہ نے کیا
نہ تو عشق سے مجھے عشق ہونے تو چاہ کی مجھے چاہ ہو	وہ جو بات منہ سے نکالی تھی سو اسی کا مجھ کو نباہ ہو

(۹۳) موجی تخلص لالہ موجی رام نام ولد دیوان لالہ جیتر پت، لازم بہا مال دولہ نواب حسین علی خاں، قوم کے کالیستہ متوطن قصبہ ساڈھی محمدی تنہا کے ساتھ مصحفی کے پاس شاگرد ہونے کو آئے، بڑے پر گوشاعر تھے، فارسی میں محقولات متعدد رکھتے تھے فارسی و اردو دونوں میں مشق سخن کرتے تھے، اردو و فارسی کے سات دیوان مرتب ہیں۔

۱۔ قدرت اللہ قائم اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں:-

”در شعر فہمی و سلیقہ درستی کلامش مرغوب است و سخنش محو القلوب“۔ تذکرۃ الشعراء، قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ بالچی پورہ

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

کیا کہوں تجھ سے جو حالت ترے بیمار کی ہے _____ تا دم مرگ تمنا سے دیدار کی ہے،
 رشتہ جاں ہوا ہر ایک تار موئے دوست _____ بے دھڑک اسے شانہ مت سمجھائیو گیسو دوست
 مانی نہ ایک بات سحر تک شب وصال، _____ میرا سر نیاز تھا اور سمیتن کے پاؤں
 کھولی جو اس نے زلف گرہ گیر کی رسن _____ زاہد کے ہاتھ باندھ لئے برہن کے پاؤں
 جاؤں گاتیشہ لیکے سوئے بے ستوں اگر _____ ٹھہریں گے سامنے مرے کب کو بہن کے پاؤں
 رواجے دادہ ام دیوان درد بیقاری را _____ نوشتہ جائے بسم اللہ مدد اشک جاری را
 داغ جز ہوئے یار با چیزے نمی سازد _____ دعا گوئید از من نکہت باد بہاری را
 گل داغ دل عشاق از آہ سحر خندہ _____ صبارا سبزہ ہیکانہ داند گلستان من
 بیایاں کئے رسد افسانہ حال پریشانم _____ شب زلف درازش کوہ است از داستان من
 نسیم صبح شامد از سر کوئے تو می آید _____ زہر گل ارشام جان من بوئے تو می آید
 اسے سنگ دل ز رحم نکاہے بسوئے او _____ موجی بہ شوق کوئے تو از خانماں گزشت

”ن“

(۹۴) ناداں تخلص میر شیر علی نام فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی، ابتدا میں میاں محمد عیسیٰ تہا
 (تلمیذ مصحفی) سے مشورہ سخن کیا بعد کو مصحفی سے اصلاح لینے لگے، نمونہ کلام سے

آزاد گرفتس سے ہوا فصل گل تو کیا _____ رونا ہے مجھ کو یہ کہ مرے بال و پر نہیں
 میں وہ اسیر ہوں جس کا بہ حسرت پرواز _____ پھرک پھرک کے قفس ہی میں کام ہوتا ہے
 ساقیا ہے یہی انصاف کہ میخانے میں _____ مے پئے غیر ترستے رہیں اک جام کو ہم
 بزم رنداں کا قدح نوش ہوتوے ناداں _____ سمجھے ہیں کفر سے بدتر ترے اسلام کو ہم

(۹۵) ناداں تخلص، میرزا محمد جان نام ولد مرزا جہدی علی خاں صوبہ دار بالنس بریلی، لکھنؤ کے رہنے والے، ابتدا میں
 ہی سے طبع موزوں رکھتے تھے، پہلے سوجی رام سوجی (تلمیذ مصحفی) سے مشورہ سخن کرتے تھے کچھ دنوں کے بعد مصحفی
 سے اصلاح لینے لگے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

عاشق مزاج کہتے ہیں طفلی سے مجھ کو لوگ _____ آمانہ تھا کبھی مجھے آرام دوش پر

گرچہ افسانے سے نیند آتی ہو مجھ کو لیکن
چھڑنے کو مرے تصویر خیالی بھی
یاد روز سیاہ ہجر دلا کر مجھ کو
قصہ عشق دل زار نے سونے نہ دیا
خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا
وصل میں بھی تو شب تار نے سونے نہ دیا

(۹۶) نالائے تخلص، میاں محمد سکری نام، یہ قوم کے مغل تھے اور شاہجہاں آباد کے پہلے وہ شاعر ہیں جو مصحفی کے حلقہ شاگردی میں آئے، میر حسن نے اپنے تذکرہ میں انھیں شاہ حاتم کا شاگرد لکھا ہے یہ محض غلط ہے، دہلی کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے، نوے برس کی عمر پاکر وفات پائی، نمونہ کلام سے

سحر کے ہونے کا از بس خیال رہتا ہے
وہ بدگمان ہوں کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے
شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے،
کانوں پہ جب رکھتا ہوں گل اک اسطوت اک اسطوت
شمس قمر رہتے ہیں تل اک اس طرف اک اس طرف

(۹۷) نحیف تخلص، شیخ عبدالکریم نام ساکن رنیر پور فارسی و اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اک دن بے گاہ چمن اجڑا بہار سے
اشک نے دل میں مرے آہ سے دی آگ لگا
بلبل نہ کر نغاں خلش نوک طار سے
شعلہ برق فرو ہونہ سکا باراں سے
ابکی موسم میں مرے ہاتھوں سے حشر عشق
اپنی بھی جا لڑی ہو اسی پردگی سے چشم
جلوے نے جس کے طور کو چھوٹکا شرار سے
ہم داغ لیچلے چمن روزگار کے
ابے دوستو تمھیں یہ مبارک ہو سیر باغ

(۹۸) نزار تخلص، سید قاسم علی نام ولد میر احمد علی ابن میر علی حسین ان کے بزرگ مشہد مقدس کے رہنے والے تھے وہاں سے آکے دہلی میں رہے وہاں نے فیض آباد میں آئے ان کا مولد و مسکن لکھنؤ تھا، یہ بہت پرگو شاعر تھے ۳۸ برس کی عمر میں دیوان مرتب کر لیا تھا،

پاس عزت ہے نہ کچھ دھیان ہو رسوائی کا
چشم بلبل ہی نہیں شیفہ رخسار کو دیکھ
حال پہونچا ہے یہاں تک ترے سودانی کا
محو ہے کبک دری بھی تری رفتار کو دیکھ
کر جائے سفر جلد کہیں جان بھی تن سے
اسکے گھر جانا نہیں چھٹنے کا اگر تجھ سے نزار
چھٹ جاؤں میں تار و زکے اس رنج و کن سے
یہ سمجھ لے کہ قضا صبح نہیں شام آئی

(۹۹) نزہت تخلص، مولوی برہان الدین نام، ولد سرفراز علی، باشندہ قصبہ ”دیوا“، ضلع الہ آباد، فارسی و اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

گو تم دم مردن مرے بالین پر آئے کیا ظلم کہ اس وقت بھی منہ ڈھانپ کر آئے
اک قامت رعنا کا تصور تھا مجھے صبح ہنگامہ محشر کے تاشے نظر آئے
چہ توں کر دہمہ مایہ دیں داری دل نگہ ناز بہت دشمن ایمانم سوخت
صحت بیماری نزہت بے مشکل بود کز تفت عشق نہاں سوزن دل بریان است

(۱۰۰) نظر تخلص، میرزا علی نام، خلف میرزا محمد زماں، مالک اشتر کے خاندان سے تھے بزرگ ان کے مدنیہ منورہ کے رہنے والے تھے لیکن میرزا نظر خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے ابتدائے عمر ہی سے اشعار موزوں کرتے تھے مصحفی لکھتے ہیں

”حالاً ترقی بسیار کردہ شعرا بہ فصاحت و بلاغت تمام می گوید و مرتبہ ریختہ برابر فارسی رسانیدہ و طرز عاشقانہ و معنی بندہ و بسیار خوب می گوید و کلامش از غلطی پاک و در فن شاعری چالاک“

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

دامن صحرا کو یکسر موتیوں سے بھر دیا وا ہوا دست سخا جب چشم گوہر بار کا
بوں پگل کے لئے جان زار آہی گئی، نفس سے چھوٹے نہ ہم اور بہار آہی گئی
رحم آتا ہے مجھے احوال سیر چرخ پر اس مسافر کو کہیں آسائش منزل نہیں
یہی ہے ایک دلیل قوی تناسخ کی تہی ہوشیشہ تو بہر نہ جام ہوتا ہے
امید ضبط تھی دل خانہ خراب سے عاشق سمجھ گیا وہ مجھے اضطراب سے
باہر ہوا میں جبر سے نہ اختیار سے کس کو مفر ہے شعبدہ روزگار سے
آسماں تیری سی بیداد گری کیا جانے کج خرامی کے سوا کج نظری کیا جانے
سوزن عیسیٰ مریم کو نہ تکلیف کرو دل صد چاک کی وہ بخیر گری کیا جانے
دل پہ جو صدمہ ہے وہ آنکھوں کو معلوم نہیں حالت خانہ نشین رہ گزری کیا جانے
لحظہ کے لحظہ وہ مہ نامہ رہاں ملے اتنی تو ہم کو داد دل اے آسماں ملے

۱۔ مصحفی نے تذکرہ ریاض الفضا ص ۳۲ میں قصبہ ”دیوا“ لکھا ہے اور نساخ نے سخن شعرا ص ۵ میں ”دیوا“ میرزا نساخ کا بیان صحیح ہے۔
۲۔ مصحفی نے ان کا نام میرزا محمد زماں لکھا ہے اور نساخ نے میرزا محمد امین۔

اطاعت دل کی واجب ہونے کو نہ مکر دیدہ ترکو
جہاں میں ہو سرا سر فیض شیشے ہی سے ساغر کو
جاننے تھے ہمیں سب کامل فن گر چہ نظر
عشق بازی میں نہ مجنوں تھے نہ فریاد تھے ہم

(۱۰۱) نگاہ تخلص شیخ حیدر علی قریشی نام ولد شیخ نواز شعلی، آیا واجداد لاہور کے رہنے والے تھے اور پشیمینہ اور گھوڑے کی تجارت کرتے تھے، نگاہ خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی، من کلامہ سے

دے نہ تکلیف سفر مجھ کو جوانی میں اجل،
کون اس موسم گرما میں وطن سے نکلے
سر کو دھنتی ہے گلستاں میں نسیم سحری،
نکبت گل تو اہلی نہ چمن سے نکلے
روح مجنوں کی لپٹی ہے بگولا بن کر
عرصہ نجد میں جو ناتھ سوار آتا ہے
کیا نامہ بری کی تھی کسی خستہ جگر کی،
بال و پر جبریل ہیں آلودہ لہو سے

”و“

(۱۰۲) واحد تخلص، شیخ محمد بخش نام ولد شیخ شاہ محمد، آبا واجداد امیٹھی کے رہنے والے تھے خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، ابتدا سے انتہا تک مصحفی سے اصلاح لیتے رہے ان کے بارے میں خود مصحفی لکھتے ہیں:-

”نہایت مہذب الاخلاق وسعادۃ مند وبارعتقاد یافتہ، ہدایت شعرش علی الرسم زمانہ بود آخر بطور شوکت بخاری سمند خیالش بہ طرف معنی بندی و نازک خیالی عطف عنان نمودہ قوت شاعری را بطوریکہ دریں زمانہ تحت لفظ خوانی خوش یافتہ خرچ می نماید۔“ ریاض الفضا ص ۳۵۱

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

عیاں کر نیچہ غم آفتاب داغ سینہ کو
کہ ہو دے صرف چاک صبح تار اپنے گریباں کا
تصور یا رکامیری نگہبانی میں ہو ہر دم
یہاں تک مرتبہ پہونچا ہے اسکی بدگمانی کا
شعلہ ہر حسن سے ظاہر نہیں دو در سیاہ
جد غنبرگوں کو کھولے ہے برائے شانہ شمع
موشگافوں سے نہیں زینت کی خواہش حسن کو
اپنی زلف میں کب کھینچتی ہو شانہ شمع

(۱۰۳) واثق تخلص، شیخ بہادر علی نام، ترمذ کے سادات سے تھے، آبا واجداد اصل میں ترمذ کے رہنے والے تھے لیکن بعد کو قصبہ چرامو میں اقامت اختیار کی، واثق یہیں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، جس زمانہ میں تحصیل علم کے سلسلہ میں لکھنؤ میں تھا، طبع موزوں کے باعث اکثر اشعار موزوں کیا کرتے تھے اور جو موزوں کرتے میر ساجد علی کے

ذریعہ مصحفی تک بھیجتے۔ اردو و فارسی دونوں میں فکر کیا کرتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

مکن آزرده دل ظالم چون آزرده جانے را زندیک ناله آزرده دل برہم جہانے را
محبت پیشگان را صبر ہم یک گونہ می باید چہرہ سوائے عالم میکنی اسے چشم تر مارا
ہر جا کہ می روم رخ او در نظر بود ہرگز میاند من و جانان حجاب نیست
مست مئے محبتم دیر و حرم مرا پہ کیست پائے خم و سبب بود سجدہ گہ ناز من

(۱۰۴) وحشی تخلص، شیخ کرم علی نام خلف شیخ فرحت اللہ، آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے، خود وحشی بھی یہیں پیدا ہوئے (ریسپس نشو و نما پائی، ابتدا میں منور خاں غافل (تلمیذ مصحفی) سے مشورہ کیا کرتے تھے بعد کو خود مصحفی سے استفادہ کرنے لگے، نمونہ کلام دیکھئے:-

آلودہ گرد خط سے روئے تباں نہ ہوئے اس باغ میں الہی دخل خزاں نہ ہوئے
قافے والوں سے کیونکر جا ملے وہ ناتواں جس کو کوسوں تک نہ آواز در معلوم ہو

(۱۰۵) دلا تخلص، مظہر علی خاں نام، عرف مرزا الطف علی ولد سلیمان علی خاں، کچھ دنوں تک ان کا قیام کلکتہ میں بھی تھا، ابتدا میں کچھ دنوں تک مرزا جان طیش سے استفادہ کرتے رہے اس کے بعد مصحفی کے شاگرد ہوئے، بعد کو میر نظام الدین ممنون سے مشورہ لیتے رہے، ان کی تصنیفات سے ایک ”بتیال چپسی“ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

مکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سنے ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر
نہ حاجت کے لئے دست دعا کو منہ پہ لانا ہوں میں اپنی زندگی سے سچ تو یہی باتھ اٹھاتا ہوں
یونہیں گور کرتے رہے ہم اشک سے تراستیں، آپ بھی رو دیں گے اک دن منہ پہ دھڑکراستیں
عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں دلا رنگن رد و آہ سرد و اشک سے تراستیں

”۵“

(۱۰۶) ہوس تخلص، نواب مرزا محمد تقی خاں نام خلف نواب مرزا علی خاں مرحوم، میرزا احمد علی خاں شوکت کے بھائی تھے، فیض آباد کے رہنے والے یہ بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ہمیشہ مقرب ملوک و سلاطین رہے ابتدا میں جو کچھ موزوں کرتے رہے میر حسن مصنف ”سحر البیان“ کو دکھاتے رہے ان کی وفات کے بعد مصحفی کو اپنا استاد بنایا اور آخر تک انھیں سے اصلاح لیتے رہے ان کی تصنیفات سے ”مثنوی“ ”لیلیٰ مجنوں“ اور

دیوان غزلیات بتایا جاتا ہے، صاحب تذکرہ سراپا سخن کا بیان ہے کہ ان کے ہر شعر میں ایلی مجنوں کا مضمون ہوتا ہے، نسخہ کہتے ہیں یہ غلط ہے اور یہی واقعہ بھی ہے، ان کا قلمی دیوان نسخہ صاحب سخن شعرا مولانا شبلی نعمانی، حسرت موہانی، عشرت لکھنوی کی نظر سے گزرا ہے اور اس کی متعدد نقلیں کتب خانوں میں موجود ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

جانہ صحرا میں کہ صحرا کہیں برباد نہ ہو دیکھ سہر صید تجھے اپنا ہی صیاد نہ ہو
ہے قسم تجھ کو کہ دیوانہ پھرے باد بہار خاک جب تک کسی دیوانے کی برباد نہ ہو
تیز رکھو سر پر خار کو لے دشت جنوں شائد آجائے کوئی آبلہ پامیرے بعد
نزع میں ہم نے عجب طرح سے دل شاد کیا آئی بچکی تو کہا اُس نے ہمیں یاد کیا
رجش کا انھوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے مجھ سے وہ بگڑتے ہیں جب خوب سنو تو ہیں
راحت ملک عدم یاد نہیں یاروں کو عالم آزادی کا بھولا ہے گرفتاروں کو
ہوئے عازم ملک عدم جو ہوس تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
پہ فرغ الم سے نہ واں بھی ملا وہاں غم یہ رہا کہ وہ ہم سے چھٹے
کبھی دیر میں تھے کسی بت پہ فدا کبھی کعبہ میں کرتے تھے جا کے دعا
ترے کوچے میں بیٹھے تو خوب ہوا کہ کشاکش دیر و حرم سے چھٹے

”می“

(۱۰۶) یاس تخلص، میر الہی بخش نام ولد رحمت علی، ان کے آبا و اجداد شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے خود یاس لکھنوی میں پیدا ہوئے، یہیں نشوونما پائی اور یہیں سن تیز کو پہنچے، فن شاعری کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھے پھر بھی کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

سامنے کیوں آئینہ حیراں نہ ہو رو دکھ کر مار مرتے ہیں ہزاروں اسکے گیسو دیکھ کر
ہیں سیکڑوں جہاں میں طر حدار آدمی بندے ہیں ہم اسی کے جو ہو یار آدمی
قاتل جو تو کرے ہے مجھے قتل بے گناہ کیا منصفی کریں گے نہ دو چار آدمی

مختار الدین آرزو

نقاشی اور موسیقی عہد قدیم میں

نقاشی کی قدامت فن نقاشی کی عمر ۵۰ ہزار سال بتائی جاتی ہے اور شمالی ہسپانیہ اور جنوبی فرانس میں اُس زمانہ کی نقاشی کے بہت سے نمونے غاروں کے اندر پائے گئے ہیں جہاں انسان پہلے رہا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ نمونے ہیں جو اسپین کے غار الٹامیر (Altamira) میں دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ۱۸۶۹ء میں دریافت ہوئے تھے لیکن عرصہ تک یہ بحث جاری رہی کہ ان کو قبل تاریخ کے زمانہ کی چیز سمجھا جائے یا نہیں، آخر کار ۱۸۹۵ء میں تمام ماہرین آثار قدیمہ نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا کہ ان کی عمر ۵۰ ہزار سال سے کم نہیں ہے۔

اس وقت زیادہ تر شکار کے جانوروں کی تصویریں غاروں کی دیواروں پر کندہ کی جاتی تھیں اور پھر انھیں سیاہ سرخ اور زرد رنگ سے رنگتے تھے اور ان نمونوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم کے انسان میں رنگ اور خطوط کے امتزاج کا احساس بہت پاکیزہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہاں کس قسم کا خط کھینچنا چاہئے اور کس جگہ کونسا رنگ بھرنا چاہئے۔ یہ نقوش اس وقت فنی حیثیت نہ رکھتے تھے، بلکہ سحر و افسوں کے طور پر بنائے جاتے تھے تاکہ شکار زیادہ دستیاب ہو اور ان نقوش کو دیکھ کر شکار کا جذبہ تازہ رہے۔

فرانس جنوبی فرانس کے لاکمبریل میں گھوڑے، ہرن، بھیڑنے، گینڈے، شیر، بارہنگے اور بیل کی تصویریں منقوش پائی گئی ہیں۔ نقاب پوش آدمیوں کی تصویریں بھی پائی گئی ہیں، لیکن وہ بہت بھدی ہیں حال ہی میں آثار قدیمہ کے ماہرین پر یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ سمیری (sumerian) تہذیب کا وجود مصری تہذیب سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔ اس بات کا ثبوت کہ نقاشی کا رواج قدیم ترین سمیری اقوام میں پایا جاتا تھا، ان منقوش ظروف سے ملتا ہے جو ار (Ur) کے کھنڈروں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے مجسمے جو تین ہزار سال قبل مسیح کے برآمد ہوئے ہیں وہ بھی بُرے نہیں ہیں اور اس کے ۵۰۰ سال کے بعد کے تو نہایت ہی اچھے ہیں۔

بابل و اسیریا جب دو ہزار سال قبل مسیح اس قوم کو بابل والوں نے مغلوب کیا تو ان کا فن بھی ختم ہو گیا، کیونکہ

بابل اور اسیریا کے لوگوں میں فنون لطیفہ کا احساس بہت کم تھا اور دستیاب شدہ منقوش مصر میں بھی مسیح سے ۳۴۰۰ سال نقاشی کا رواج پایا جاتا تھا، جس کا ثبوت قدیم قبروں کے ظروف سے ملتا ہے۔ ان کے یہاں دیواروں پر بھی نقوش بنانے کا رواج تھا اور جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے علاوہ جہازوں کی تصویریں بھی بناتے تھے۔

قدیم مصر ہرمی عہد (Pyramid age) میں مقبروں کے اندر جو تصویریں بنائی جاتی تھیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال پہلے مصریوں کی تہذیب و معاشرت کا کیا رنگ تھا۔ یہ نقوش پتھر کے اندر کئے جاتے اور پھر ان میں مختلف رنگ بھرے گئے ہیں۔ چونکہ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اسکو انھیں تمام اشیاء کی ضرورت رہتی ہے جن سے وہ دنیا میں کام لیا کرتا تھا، اس لئے مقبروں میں بھی انھیں تمام چیزوں کی تصویریں منقوش ہوتی تھیں۔

ان کے فن مجسمہ سازی کا بہترین نمونہ ابوالہول (xanthus) کا مجسمہ ہے جو ایک ہی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے، اس کے سر کا دور ۹۱ فٹ کا ہے اور پیشانی سے ٹھوڑی تک کا فاصلہ ۱۹ فٹ ہے۔ ہنڈی ۲۶ فٹ ہے اور جسم کا حیوانی حصہ ۱۷ فٹ لمبا ہے۔

چین چینیوں کی نقاشی کا پتہ صرف دو ہزار سال قبل تک کا چلتا ہے، لیکن غالباً اس کی عمر اس سے زیادہ ہے۔ چینیوں کے لئے نقاشی جزو زندگی ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نقاشی سے خالی ہو، یہاں تک کہ ان کی تحریر خود نقاشی ہے۔

قدیم چینی نقاشی کا بہترین نمونہ وہ ہے جس میں خاندان چنگ کے دربار کا نقشہ پیش کیا گیا ہے (۶۲۶ء - ۶۰۵ء) جس آرٹسٹ کی یہ تصویر ہے اس کا ایک نہایت مشہور نقش وہ ہے جس میں ایک نظم "دختر بحر" کو مسطور کیا گیا ہے۔ اس نقاش کا نام کوکائی چنگ تھا۔ اس سے بھی زیادہ نقاش وہاں کا وقتاوتز و تھا جو خاندان تانگ (۶۱۸ء - ۹۰۷ء) کے عہد میں پایا جاتا تھا۔ اس سے بہت سی تصویریں طیار کیں لیکن سوائے چند نقوش کے اب ان میں سے کوئی دستیاب نہیں ہوتی، اس خاندان کے زمانہ میں دو اور مشہور نقاش پائے جاتے تھے۔ یوچی اور پن ہمین۔ منطری نقاشی کی ابتدا وہاں کی سونہون نے کی جو ساتویں صدی کے وسط میں پایا جاتا تھا۔ ہزر، نیلے اور سرے رنگ یہ زیادہ استعمال کرتا تھا اور دریاؤں، پہاڑوں اور جھیلوں کو بہت نمایاں طور پر دکھاتا تھا۔

آٹھویں صدی میں وہاں حیوانات کی تصویر بنانے والے متعدد نقاش پائے جاتے تھے۔ ان سب میں بان کان بہت مشہور ہوا جو زیادہ تر گھوڑوں کی تصویریں بتاتا تھا۔ دسویں صدی کی ابتدا میں وہاں نقاشی کا موضوع "پھول" قرار پایا اور بعد کو اس نے بہت رواج پایا۔

عہد قبل تاریخ کی نہایت قدیم نقاشی کے نمونے شمالی وسطی ہندوستان کے غاروں میں بہت پائے جاتے ہیں۔ ان میں بھی شکار کے جانوروں اور شکار کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے، گینڈے اور بارہ سنگھے کے شکار کا سین اور گھوڑے، ہرن اور زرافہ کی تصویریں ان میں دکھائی گئی ہیں۔

اس عہد کے نہایت مشہور نقوش وہ ہیں جو بدھ کے مندروں اور خانقاہ اجنٹا کی دیواروں پر نقوش ہیں۔ ان میں سے بعض پہلی صدی ہجری سے بھی پہلے کے ہیں۔

گیارھویں بارھویں صدی میں، خاندان پال کے زمانہ میں ایک نہایت مشہور مسلک نقاشی کا بہار و بنگال میں پایا جاتا تھا۔ تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک گجرات میں ایک خاص مسلک نقاشی کا رائج تھا جو زیادہ تر جینی مذہبی کتابوں کو مصور کیا کرتا تھا۔

ہندوستان کا وہ انداز نقاشی جسے ”راجپوت اسکول“ کہتے ہیں، خاص شہرت رکھتا ہے۔ اول اول اس کے نقاش صرف دیواروں کو اپنے نقوش سے آراستہ کیا کرتے تھے۔

جس کے اچھے نمونے پیکانیر کے پرانے محلوں میں نظر آتے ہیں۔ اس اسکول کی نقاشی میں رنگوں کا ابھار خاص چیز ہے خطوط اور ہیئت پر اول اول کم توجہ دیا جاتا تھا۔

کانگریا اسکول نقاشی میں بہت مشہور ہوا جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں پایا جاتا تھا۔ یہی زمانہ مغل آرٹ کے بھی ترقی و تکمیل کا تھا جو ایران و ہندوستان دونوں جگہ کے ذوق پر مشتمل تھا۔

غاروں کی نقاشی کے سلسلہ میں، بعض نہایت قدیم نقوش انکا میں بھی پائے جاتے ہیں اس فن کی یونان ترقی اور قدر شناسی کے لحاظ سے یونان کا وہ عہد جو پانچویں اور چوتھی صدی ہجری سے تعبیر کیا جاتا ہے خاص زمانہ تھا، دنیا کا کوئی قدیم آرٹ ایسا نہیں جس نے یونان کی نقاشی سے زیادہ موجودہ زمانہ کے تمدن کو متاثر کیا ہو۔ اول اول وہاں کے مجسمہ ساز اور نقاش عریاں جسم انسانی کو پیش کرتے تھے، ان کے سامنے قدرتی مناظر پہاڑ، دریا، اور صحرا کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔

قدیم یونانی عہد کا کوئی نقش سوائے گلدانوں کے اس وقت نہیں پایا جاتا۔ گلدانوں کے نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہربوں سے زیادہ اس فن کے باہر تھے۔

قدیم یونانی نقاشوں میں پولیگ نوٹس بہت مشہور ہوا ہے جو یونانی علم الاصنام کا نقاش تھا۔ اس نے بہت سی روایات اصنامی کو دیواروں پر نقوش کیا، ارسطو بھی اس کا بڑا مداح تھا۔

جنوبی اطالیہ کا نقاش زیوکس (پانچویں صدی قبل مسیح) بھی بڑا مشہور آرٹسٹ ہوا ہے۔ اس کی اطالیہ مہارت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اس نے انگور کے خوشہ کی تصویر بنائی تو چڑیاں آکر اس پر چوچ مانے لگیں

قدیم زمانہ کا سب سے زیادہ مشہور نقاش اپلیس مانا جاتا ہے جو کوکوفن (آئی ادینا) میں پیدا ہوا تھا۔ قیام انسانی تصویر کھینچنے کی ابتدا اسی نے کی اور اس فن کو کمال تک پہنچا دیا۔ اسکندر اعظم کی بھی تصویر اس نے بنائی تھی اور حکومت مقدونیا کے بہت سے امراء کی بھی۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور تصویر وہ ہے جس میں محبت کی دیوی کو اپنے بال بچڑتے ہوئے دکھایا ہے جب وہ سمندر سے پیدا ہو کر باہر نکلی ہی تھی۔

اس تصویر کو روم کے سب سے پہلے بادشاہ اگسٹس نے جس قیمت میں خریدا وہ موجودہ سکول میں ۲۰ ہزار پونڈ (دھائی لاکھ روپیہ سے زائد) ہوتی ہے۔

تیسری صدی قبل مسیح میں یونانی نقاشی پر زوال آنا شروع ہوا اور دوسری صدی میں اہل روم نے اس کو اپنے آرٹ میں شامل کر کے ایک نئے آرٹ کی بنیاد ڈالی جو یونانی آرٹ سے بہت فروتر تھا۔

رومن قوم کے آرٹ پر اس سے پہلے فلسطینی اثر پڑ چکا تھا (جو ذاق، مصر، اور یونان کی نقاشیوں کا امتزاج تھا) لیکن جب یونانی نقاشی کے اثرات براہ راست اس پر پڑے تو اس میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ چنانچہ یورپ کا سب سے پہلا اسکول نقاشی گیوٹو (اطالوی) ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ یہ آرٹسٹ تیرھویں صدی کے اخیر میں پایا جاتا تھا اور اپنا وقت زیادہ تر دیواروں اور قربانگاہوں کی نقاشی میں صرف کرتا تھا۔ یہ فن تعمیر کا بھی بڑا ماہر تھا۔

اس کے بعد پندرھویں صدی کے اخیر میں لیونارڈو ڈاؤنچی پیدا ہوا جس کی تصویر پر مونا لیزا خاص شہرت رکھتی ہے، یہ نقاش ہونے کے علاوہ مجسمہ ساز بھی تھا، شاعر بھی تھا۔ اس کا ہم عصر میکائیل انجلو جو بت سازی اور نقاشی میں اپنے عہد کا سب سے بڑا آرٹسٹ مانا گیا ہے۔ اس کا نہایت عجیب و غریب کارنامہ وہ نقاشی ہے جو اس نے کلیسائے روم کی چھت میں کی ہے اور جس میں اس کے چار سال صرف ہوئے۔

اسی زمانہ میں جرمنی نے ایک آرٹسٹ پیدا کیا جس کا نام البرسٹ ڈورا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ لکڑی اور تانبہ پر کھدائی کا کام کرنے میں اس کا جواب نہ تھا۔ فلینڈر (بلجیم) کا نہایت مشہور نقاشس پیٹر پال رومنیس تھا (۱۵۵۷ء - ۱۶۰۷ء) اس نے انگلستان پہنچ کر بڑا نام پیدا کیا اور ریشٹل گیری میں اس کی بعض تصویریں اب تک محفوظ ہیں۔

دُچ اسکول کی نقاشی میں رمبرانڈ بہت مشہور ہوا (۱۶۰۶ء - ۱۶۶۹ء) یہ دنیا کے نقاشی کا شیکسپیر مانا جاتا تھا۔ اسی طرح اسپین، فرانس اور انگلستان میں بعض اچھے اچھے نقاش پیدا ہوئے، ان کی فہرست ملاحظہ ہو:-

اسپین:- دلاسکوٹز (۱۵۹۹ء - ۱۶۶۶ء) یہ دنیا کے چوٹی کے نقاشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فرانسسکو گویا (۱۷۸۲ء - ۱۸۴۸ء) بھی اسپین کا مشہور آرٹسٹ تھا اور موجودہ آرٹ پر اس کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔

فرانس :- سب سے پہلا فرانسیسی ماہر فن نکولس پوسین تھا (۱۵۹۴ء - ۱۶۶۵ء) اس کا موضوع زیادہ تر مناظر کی تصویر کشی تھا۔ اسی کا ہم عصر کلاڈ لورین (۱۶۰۰ء - ۱۶۸۲ء) بھی تھا اور اس کی ٹکر کا آرٹسٹ تھا۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی میں انٹوائن وائیٹو، اور فرگونا رڈ بہت مشہور ہوئے۔ انیسویں صدی میں اچھے نقاشوں کی تعداد وہاں کافی ہو گئی۔

انگلستان یہاں کی نقاشی میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بنیاد اخلاق پر قائم تھی وہاں جو نقوش تیار کئے جاتے تھے، ان میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ کوئی اخلاقی درس اس سے حاصل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ولیم ہوگرتھ (۱۶۹۴ء - ۱۷۶۴ء) کا نام لیا جاتا ہے، تصویر کا ایک ایسا مرقع طیار کیا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ عورتوں کے ساتھ قید خانوں میں کتنا برا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چار اور مشہور نقاش پیدا ہوئے سر رینالڈز (۱۷۲۳ء - ۱۷۹۲ء)، گینس برو (۱۷۲۴ء - ۱۷۸۱ء)، جارج رومنی (۱۷۳۴ء - ۱۸۰۲ء) اور ٹامس لارنس (۱۷۶۹ء - ۱۸۳۳ء)، رینالڈز بڑا محنتی تھا اس نے تقریباً چار ہزار نقش طیار کئے، کہا جاتا ہے کہ رنگ بھرنے میں اس کا نظیر پیدا نہیں ہوا۔

گینس برو، مناظر و انسان دونوں کی تصویر کشی کرتا تھا، یہ بہت تیز مزاج تھا اور ایک بار رینالڈز سے لڑ بھی گیا تھا۔ رومنی نے بادشاہوں اور امراء کی تصویریں زیادہ بنائیں اور ہر چند اس کی سالانہ آمدنی بیس ہزار پونڈ سے کم نہ تھی، لیکن وہ مقروض ہی مرا۔ منظر کشی میں کانسٹیبل (۱۷۶۶ء - ۱۸۳۴ء) اور جوزف ٹرنر (۱۷۶۵ء - ۱۸۵۱ء) نے خاص شہرت حاصل کی۔

بعض تصاویر کی غیر معمولی قیمت گزشتہ پچاس سال کے اندر یورپ میں اس فن کی عظمت بہت بڑھ گئی ہے اور امراء پرانی تصویروں کو بڑی بڑی قیمت پر خریدتے ہیں۔ ذیل کی ایک فہرست سے معلوم ہوگا کہ تصویروں کی کتنی بڑی قیمتیں امراء مغرب نے ادا کی ہیں :-

تصویر کا عنوان	نقاش	قیمت
Welsh Funeral	ڈیڈ واکس	۲۵۲۰ پونڈ
Lady Betty Del	رینالڈز	۱۱۵۵۰ پونڈ
Duchess of Devonshire	گینس برو	۱۰۵۰۰ پونڈ
Ladies Spence	رومنی	۱۰۲۵ پونڈ
Harvest wagon	گینس برو	۵۴۰۰۰ پونڈ
Bath Sheba	رہبرائٹ	۴۴۰۰۰ پونڈ

ایک لاکھ پونڈ
دو لاکھ پونڈ

گینس برو
رینالڈز

Blue Boy.
Mrs. Siddons

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تصویریں ہیں جن کی مجموعی قیمت لاکھوں پونڈ ہوتی ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی تصویریں
آویزاں ہے۔ یہ نقش ٹنٹرٹو کا ہے اور اس کا عنوان "Paradise"
ہے یہ تصویر ۸۲ فٹ لمبی اور ۳۳ فٹ چوڑی ہے۔

اسی موضوع کو مگنارڈ نے پیرس کے ایک گرجا کی دیوار پر نقش کیا ہے جس میں ۳۰۰ آدمیوں کی تصویریں ہیں
اور ہر تصویر اصل قد سے لگنی بڑی ہے۔ "Last judgement" کی ایک تصویر کارنیلینس کی
بنائی ہوئی مینوچ کے گرجا میں پائی جاتی ہے جو ۵۹ فٹ چوڑی ہے۔

مشہور مجسمے
دنیا کا قدیم ترین مجسمہ جو انسان نے بنایا غالباً ارنابھینسے کا ہے۔ یہ مجسمہ مٹی کا ہے جو فرانس میں
دستیاب ہوا۔ زہرہ کا مشہور مجسمہ جزیرہ ہلوس پائا گیا تھا اور ہرٹس کا مجسمہ یونان میں۔

اس وقت کا سب سے بڑا مجسمہ وہ ہے جو "آزادی" کا مجسمہ کہلاتا ہے اور نیویارک کے بندرگاہ پر نصب
ہے۔ یہ ۵۰ فٹ اونچا ہے اور ۷۷ فٹ بلند چپوترے پر قائم ہے۔ یہ تانبا اور لوہے سے بنایا گیا ہے اور ۱۰۰ ٹن
وزنی ہے۔ اس کا سر اتنا بڑا ہے کہ اس کے اندر میں آدمی سما سکتے ہیں۔

جزیرہ ایسٹر (جو چلی کے مقبوضات میں ہے) نہایت سنسان جزیرہ ہے یہاں آتش فشاں پہاڑوں کا
سلسلہ پایا جاتا ہے اور اس کا دور صرف ۲۹ میل کا ہے۔ یہ ۲۳۰۰ میل دور واقع ہے، اور جب مجرموں کو جلاوطنی
کی سزا دی جاتی ہے تو یہیں بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اس وحشت ناک جزیرہ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز یہاں
کے وہ مجسمے ہیں جو پہاڑوں کے پچھلے ہوئے مادہ سے طیارے کئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد ۵۵۰ سے اوپر ہے، ان میں
سے بعض ۷۷ فٹ اونچے اور سوٹن سے زیادہ وزنی ہیں، ان میں سے اکثر لیٹی ہوئی حالت کے ہیں اور ان کا ایک
حصہ زمین میں مدفون ہے۔

ماہرین نے مختلف نظریے قائم کئے ہیں، لیکن صحت کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب اور کیوں طیارے
کئے تھے۔

موسیقی
بارہ صدوں کی سرگم کارواج مسیح سے تین ہزار برس قبل چین میں پایا جاتا تھا اور ۲۰۰۰ قبل مسیح میں
بادشاہ ہوانگ ٹی نے ایک ماہر فن لنگ سن کو حکم دیا تھا کہ اصول موسیقی پر کتاب لکھے۔
قدیم مصریوں میں لکھی ہوئی موسیقی کو سامنے رکھ کر بانسری، بگل، اور ڈھول بجانے کا رواج پایا جاتا تھا۔

یہودیوں کے یہاں کئی آدمی ملکر گاتے تھے اور قدیم ہندوستان گانے اور بجانے دونوں سے واقف تھا۔ ان کے یہاں تار کے ساز اور منہ سے بجائے جانے والے اور پیٹے جانے والے ہر قسم کے پاسے جاتے تھے۔ برطانوی عجائب خانہ میں قدیم بابل کی موسیقی کا ایک نمونہ مسطح کی تختی پر نقش کیا ہوا محفوظ ہے۔ یہ عیسوی زبان میں ہے لیکن اس کا ترجمہ بابلی زبان میں بھی دیدیا گیا ہے۔ یہ بہت کچھ اس صینی موسیقی سے ملتا جلتا ہے جو دو انگلیوں سے آٹھ تار کے رباب پر بجائی جاتی تھی۔

یونانی ہر چند علمی حیثیت سے موسیقی کے ماہر نہ تھے، لیکن علاً ان کے یہاں گانا بجانا دونوں پایا جاتا تھا۔ بالشری بہت مقبول ساز تھا اور اسکولوں میں اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ افلاطون نے بھی موسیقی کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

فوج میں پتیل کے بنے ہوئے سازوں کا رواج عہد قدیم سے چلا آتا ہے۔ اہل روم انھیں مذہبی مراسم کے وقت بھی استعمال کرتے تھے۔

اہل برطانیہ کی ابتدائی موسیقی کا حال بہت کم معلوم ہے، بریط کا رواج سب سے پہلے آئر لینڈ میں ہوا، (سنہ ۱۷۵۰ء)۔ عام اعلان یا خطرہ کی اطلاع دینے کے لئے جانوروں کے سینگوں سے کام لیتے تھے اور اسی لئے انھیں قرنا کہتے ہیں (قرن بمعنی سینگ)۔ ان سینگوں سے پیالوں کا کام بھی لیا جاتا تھا اور ان میں شراب بھر کر پی جاتی تھی۔

دنیا کا قدیم ترین بریط وہ ہے جو ۱۹۳۴ء میں بمقام آر دستیا ب ہوا، اس کے دوسرے سال ہٹا پسٹ کے قریب قدیم ترین ارغنوں دستیا ب ہوا۔

لٹکا کی مذہبی روایات کی بناء پر سب سے پہلا تار کا ساز راون نے بنایا تھا۔ لکڑی کے ایک ٹکڑے پر دونوں طرف دو کھوشیاں لگا کر دو تار کھینچ دئے گئے تھے۔

یونانی روایت کے مطابق سب سے پہلے اپالو نے کچھوے کی ہڈی پر تار کھینچ کر بریط تیار کیا تھا۔ عربوں کے یہاں بھی مزامیر (منہ سے پھونکے جانے والے) اور تار والے ساز دن کا بہت رواج تھا اور یورپ نے عرب موسیقی کے اثرات کو بڑی حد تک قبول کیا۔

سترھویں صدی میں اس صنعت نے غیر معمولی ترقی کی، چنانچہ ایک ایک وائلن میں ہزاروں پونڈ خرچ کئے گئے۔

بعض استفسارات

ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا جواب صرف خط کے ذریعہ سے دیا جاسکتا ہے بنا براں ہر استفسار کے ساتھ جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے
مینجر ننگار

مطالعہ لغت

اگر کہا جائے کہ کتابوں کا مطالعہ مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے تو کسی کو ماننے سے انکار نہ ہوگا، بلکہ شاید یہ بھی کہا جائے کہ اس میں بھلا بتانے کی کوئی بات تھی، سبھی جانتے ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ لغت کا مطالعہ بہت زیادہ مفید اور بہت زیادہ دلچسپ ہے تو کم سے کم اسے ایک مذاق ضرور سمجھا جائے گا۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی کہ لغت کا مطالعہ نہایت مفید و دلچسپ مشغلہ ہے۔ اور ایک تصنیف و تالیف کا شوق رکھنے والا اپنے مقصد کے ساتھ سچا ہے تو اس کے لئے ناگزیر ہے۔

سوچئے گا تو دنیا کی سب سے پہلی تصنیف لغت ہی کو قرار دینا پڑے گا۔ آدم جس طرح سب سے پہلے انسان تھے اسی طرح سب سے پہلے لغت نویس بھی تھے۔ تورات میں مذکور ہے کہ آدم جب جنت سے دنیا میں پھینکے گئے تو انھوں نے جو پہلا کام کیا وہ جانوروں کے نام رکھنے کا کام تھا۔ قرآن میں آیا ہے کہ ہم نے آدم کو اسماء کا علم دیا۔ لیکن آدم کی لغت نویسی کو اپنی تحریر پر قیاس نہ فرمائیے۔ یہ فنون کے وجود میں آچکنے کے بعد کا مفہوم ہے۔

الفاظ کا استعمال ہر شخص کرتا ہے، لیکن جو شخص الفاظ سے جتنا واقف ہوتا ہے اُن سے اتنا ہی کام لے سکتا ہے۔ ہر زبان میں ایک مفہوم کے لئے متعدد لفظ اور مختلف اسلوب بیان ہوتے ہیں، لیکن ایک موقع پر کوئی شخص اگر موقع کا لفظ نہیں بولتا تو اپنا مقصد فوت کر سکتا ہے۔ ایک وکیل مقدمہ ہار سکتا ہے، ایک دوکاندار گاہک کھو سکتا ہے ایک لیڈر کی تجویز گر سکتی ہے، دس ملے ہذا۔ چنانچہ میرا عقیدہ ہے کہ لفظوں کو صحیح طور پر جاننا ہر خاص و عام کی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔

رسکن نے کہا کہ تم الفاظ کے صحیح استعمال پر اس وقت تک قادر نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کی روح سے آشنا نہ ہو۔ بنا بریں الفاظ کو جاننا ایک چیز ہے اور اُن کی روح سے آشنا ہونا دوسری۔ اور ایک انشائی کے لئے الفاظ کی روح سے آشنا ہونا گویا اُن سے محبت کرنا ہے۔ کتاب کے مطالعہ میں لفظ سیاق و عبارت کے اندر محدود حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے، اس لئے کتاب میں ہم ایک لفظ کو اُسی محدود حیثیت میں جان سکتے ہیں۔ الفاظ کی روح سے آشنا ہونے کے لئے لغت کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ لغت کے اندر الفاظ کے جملہ معانی اور اس کے مفہوم کے

تمام پہلو ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ہم اس کی روح معانی کو عریاں دیکھ سکتے ہیں۔ لغت کے اندر الفاظ کتاب کی طرح پوشش و لباس میں لپٹا نہیں ہوتا۔

لغت کے اندر تمام اچھے اور برے الفاظ درج ہوتے ہیں، اور وہ سب محبت کئے جانے کے قابل ہیں۔ بالخصوص کوئی اہل قلم اور صاحب مطالعہ شخص ان الفاظ سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ذخیرۃ الفاظ سے اُسے جتنی کم محبت ہے، وہ اپنی زبان کی روح ادب سے اتنا ہی بیگانہ ہے اور اس طرح اپنے مقصد و انتشار کے ساتھ اتنا ہی غیر مخلص۔

جس طرح ایک طالب علم اسکول سے غائب ہو جاتا ہے، اگر ہم اُسی لڑکے کی طرح کبھی کبھی تھوڑا وقت نکال کر اپنی لغت کا مطالعہ کر سکیں تو اس وقفے میں ہم بڑے بڑے طلسمات کی سیر کر سکتے ہیں۔ فرہنگ کا مطالعہ طلسم شہرہ کے مطالعہ سے زیادہ دلچسپ، تمدن عرب کے مطالعے سے زیادہ سبق آموز، اور فلسفہ جذبات کے مطالعے سے زیادہ علم آفریں ہو سکتا ہے۔ جو اس کی یہ ردیف دار فرہنگ ایک متحرک کر دینے والا رومان ہوتا اور معدنی اشیاء کی یہ فہرست کسی سفر نامے سے بہتر معلم ثابت ہوتی ہے۔

لغت کو اگر دیکھئے تو ایک ردیف دار کائنات ہے! تمام کتابوں سے اعلیٰ اور بڑی کتاب ہے کہ کچھلی تمام کتابیں اسی کے اندر سے نکلیں اور آئندہ کی بے شمار کتابیں بھی اسی کے اندر سے نکالی جائیں گی۔ لغت میں مندرجہ ردیف دار الفاظ حقیقت میں قومی زندگی کے اعضاء و اعصاب کی ایک ایسی تصویر ہے جیسی ڈاکٹروں کے مطلب میں انسانی بدن کی تشریح کی تصویر ٹنگی ہوتی ہے۔ لغت کے اندر الفاظ میں اُس زبان کو بولنے والی قوم، اسلاف و اخلاف، سب کی اور ایک حد تک دوسری قوموں کی بھی، ذکاوت و ذہانت اور طبیعت و فطرت، جلوہ گر نظر آتی ہے۔ لغت کی کتاب کے اندر ایک پوری قوم کی نسلوں کے عندے اور شقتیں، رنج اور راحتیں، محفوظ ہوتی ہیں، ایک زبان کی لغت کو اس زبان کو بولنے والی قوم کی اجتماعی اور انفرادی فطانت (جنین) کا خزانہ کہا گیا ہے۔

لغت کا مطالعہ ہم دو جہت سے کر سکتے ہیں، ایک تو اس کے اندر معنی و مفہوم پیدا ہونے کی طلسم سامانی کے پہلو سے دوسرے اس کے غیر محدود علمی و تاریخی افادے کے رنج سے۔ ایک میں ہم کھو جاسکتے ہیں اور دوسرے میں بے اندازہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہماری زبان کی عمر و حیثیت زبان زیادہ نہیں، اور اسی لئے ہماری فرہنگ بھی مختصر ہے اور جس قوم کی فرہنگ مختصر ہو وہ مسلمہ طور پر حصول علم میں پیچھے رہتی ہے، اور معاملات زندگی میں اُسی حد تک سوچ سکتی ہے جس حد تک اس کی لغت کے الفاظ ساتھ دے سکیں۔ مگر یہ بھی ایک قدرتی بات ہے کہ کم مایہ زبان کسی دوسری متمول زبان کی مدد لے کر متمول بنتی ہے۔ جس طرح آج انگریزی زبان کی مدد سے ہندوستان کی زبانیں متمول ہو رہی ہیں اور

ہوں گی، اور جس طرح گزشتہ عہد میں فارسی سے مستفید ہو چکی ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسوقت ہم علمی، فنی، اور سیاسی مسائل میں منہمک ہو کر جو کچھ بھی سوچ رہے ہیں یہ ہمارا قومی ذہن و دماغ انگریزی میں سوچتا ہے۔ ہم نے انگریزی حاصل نہ کی ہوتی تو غور و فکر کی اس سطح پر نہ ہو سکتے تھے جہاں ہم اسوقت ہیں۔

لیکن کم مایہ زبان کی لغت میں بھی اس زبان کو بولنے والی قوم کی زندگی زندہ ہوتی ہے، اور کہیں کہیں دوسری مزدبوم کی زندگی بھی بولتی چالتی دکھائی دیتی ہے۔

جسوقت ہم اپنی زبان کی لغت کا مطالعہ کرنے بیٹھیں گے تو نظر آئے گا کہ ہر لفظ کسی عندئے یا خیال کی تصویر اور کسی احساس کا نقش ہے، ایسے احساس کا نقش جو پہلے ایک عندیہ ہی تھا اور پھر بیشمار انسانوں کا احساس بن گیا اور اب تک ہے۔ عندیات و احساس کا یہ خزانہ ہمارے اسلاف کے اور ہمارے جسم و جان، بلکہ کسی حد تک انسانیت کے جسم و جان کی مشقتوں کا حاصل اور عطر ہے۔ اپنی لغت کے اندر ہم اُس زندگی کے پورے سلسلے کو زندہ دیکھ سکتے ہیں جو ہمارے مقدس وطن کی پاک ہوا میں سانس لے چکی ہے اور لے رہی ہے۔

اب دوسری قوموں اور غیر مزدبوم کی زندگی کا نقشہ دیکھنے کے لئے ان دو لفظوں کی حقیقت و اصلیت پر غور فرمائیے :-

ہماری زبان میں ایک لفظ ہے ”شاخسانہ“۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ صحیح ”شاخشانہ“ تھا مگر ایران ہی میں ”شاخسانہ“ بن کر ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن اس کے معنی ایران میں پہلے دھونس دیکر وصول کرنا تھے اس لفظ میں یہ مفہوم اس طرح پیدا ہوا کہ ایران میں مانگنے والوں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو بات میں سینگ (یعنی شاخ) اور شامنے کی پڑھی لکھی ہوتے تھے اور بھیک لئے بغیر نہ ٹٹلتے تھے (اس گروہ کا مشن ہمارے یہاں بھی ہر چرٹے کہلاتے ہیں) اس لفظ حب ہمارے زبان میں داخل ہوا تو نہ معلوم کس پر اسرار طریق پر اس کا مفہوم عیب، خرابی، اور نکرار وغیرہ ہو گیا۔

دوسرا لفظ کو تو ال ہے۔ یہ خالصتاً ہندی لفظ ہے اور کوہ (یعنی وہ جگہ جہاں سپاہی بند و قیں اٹھا کر دیتے ہیں) اور وال دو لفظوں سے مرکب ہے۔ بعض کے نزدیک کوہ نہیں بلکہ کوٹ یعنی حصار یا قلعہ ہے۔ وال کے ہندی معنی صاحب کے معلوم ہی ہیں۔ بہر حال یہ ہندی لفظ ایران جا پہنچا۔ جس کے پہنچنے کی وجہ اور طریقہ یقیناً دلچسپ ہوگا۔

مقامات کے نام اپنے اندر ایک پوری تاریخ لئے ہوتے ہیں، جس سے بہت سے معاشرتی حقائق کا استنباط کیا جاسکتا ہے اور ایک اچھے لغت میں یہ خزانہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ چیز ناموں کی وجہ تسمیہ پر نظر ڈالئے :-

گیا کا نام آپ نے سنا ہوگا کہ صوبہ بہار میں ایک شہر ہے جو بودھ مت والوں کی نظر میں بہت مقدس مقام ہے اور ہندوؤں کا بھی بڑا تیرتھ ہے۔ بودھ مت کی روایات سے قطع نظر کر کے صرف ہندو نقطہ نظر سے دیکھئے تو اس کے متعلق دور وایتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ راج رشی گوئی نے ایک یوگ کر کے بہت سی گائیں برہمنوں کو بن میں دیں تو ان سے دیوتا بہت خوشی ہوئے اور گیا کا ان سے منسوب ہونا مقدر کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس شہر کو گیا شہر سے نسبت ہے جو دشنو بھگوان کے بہت بڑے بھگت گزرے ہیں۔ یا یعنی خدائے موت نے جب دشنو بھگوان کو گیا شہر سے اس قدر خوش دیکھا تو اس خیال سے کہ گیا شہر کی روح قبض کرنا دشوار ہوگا، انھوں نے دشنو جی کو توجہ دلائی اور دشنو جی نے گیا شہر پر ایک چٹان پھینک کر انھیں مار ڈالا۔ مگر چونکہ گیا شہر کی بھگتی زبردست تھی، اس کی وجہ سے دشنو بھگوان نے گیا کو تمام دیوتاؤں کا استھان قرار دیدیا اور اس مقام کو یہ خاص برتری بخشی کہ جو شخص وہاں تیرتھ کو آئے گا اور شہر آدھ یا پنڈواں کرے گا اس کے اسلاف کو دشنو پد میں جگہ ملے گی یہی بنا تھی کہ اہلیا بائی نے گیا میں دشنو پد کا مشہور مندر تعمیر کرایا۔

آپ یہی جانتے ہیں تو جی آئی پی کے راستے سے خاندیس کا علاقہ بھی پڑتا ہے۔ اس لفظ کو سنکر آپ کا خیال فوراً اس طرف جائے گا کہ یہ پٹھانوں کی بستی ہوگی یا پٹھانوں نے آباد کیا ہوگا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں یہ پھیل قوم کا علاقہ ہے اور اسے پھیلوں کے ایک قبیلے کھاند سے نسبت ہے۔ اس سے اتنا تو قطعی طور پر ظاہر ہو گیا کہ قبیلہ بہت با اثر تھا۔ مسلمانوں نے تلفظ کی سہولت کے قاعدے سے اسے خاندیس بنا دیا جو آج تک بولا جاتا ہے۔

آریا نسل کے پروہت یعنی برہمن جب اس ملک میں آئے تو پہلے پنجاب میں رہے تھے اس لئے پنجاب کا پرانا نام پرہیا ورت ہے اور شمالی ہندوستان کا باقی حصہ آریا ورت کہلایا، کیونکہ آریا اس تمام علاقے میں پھیل گئے تھے۔ لیکن بعد میں راجہ بھرت کے نام سے سارا ملک بھارت ورش کہا جانے لگا۔

اب چند لفظ ایسے بھی دیکھ لیجئے جن کو ہماری تاریخ معاشرت سے تعلق ہے اور جن پر غور کرنے سے ہندوستان کی دو پڑی قوموں کے باہمی ارتباط پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کتھک سے ہم رقص یعنی مردنا چنے والا مراد لیتے ہیں، اور فنی اعتبار سے کتھک کا ناچ کامل سمجھا جاتا ہے۔ اب دیکھئے اس لفظ میں یہ مفہوم کس طرح آیا۔ ہندی میں ایک لفظ ہے کتھا جس کے معنی وعظ و بیان کے ہیں ہندی میں فعل کے ساتھ حرف کاوی بڑھا دینے سے اسم فاعل بن جاتا ہے۔ چنانچہ کتھک کے معنی ہوئے کتھا کہنے یا مدح کرنے والا۔ اب چونکہ صناعیت رقص کا مقصود اظہار ہے اور ہندو مذہب میں شوالوں کی مورتیوں کے سامنے رقص کے ذریعے سے اظہار عبادت اور جذبات بندگی کا اظہار و بیان کیا جاتا ہے اس لئے رقص کو کتھک کہا گیا۔ لیکن اب اس لفظ میں اظہار بندگی و عبادت کا مفہوم نہیں رہا، صرف مردنا چنے والے کے مفہوم

میں بولا جاتا ہے، حالانکہ قص عبودیت ترک نہیں ہوا اور کتھک اب بھی قص کرتا ہے۔

آپ اکثر بولتے اور سنتے ہوں گے ”میاں ہٹاؤ اس کھڑاگ کو“ ”یہ کہاں کا کھڑاگ لے آئے“۔ یہ لفظ کھڑاگ ہر اس بات کے متعلق بولا جاتا ہے جس سے ہمیں اچھن ہوتی ہو، جو ہماری سمجھ میں نہ آئے، جو معاملے سے متعلق نہ ہو وغیرہ۔ اصل لفظ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کھٹ سنسکرت میں چھ کے عدد کو کہتے ہیں اور راگ کے معنی معلوم ہیں، یعنی چھ راگ۔ کھڑاگ ایک راگ کا نام ہے جو چھ راگوں یعنی بھیروں، سرتی، میگھ، ہنس، دل دیپک اور مالکوس کو ملا کر گایا جاتا تھا۔ پھر بعد میں سرتی راگ کے پانچویں پتر کا یہی نام پڑ گیا۔ اب معلوم نہیں کہ بہادر شاہ ظفر اس مخلوط راگ کے شیفۃ تھے یا سرتی راگ کے پانچویں پتر کے، یا یہ دونوں اصل میں ایک ہیں، مگر اتنا ظاہر ہے کہ کھڑاگ بہت اعلیٰ اور پسندیدہ راگ تھا۔ ظفر کا مصرعہ ہے: ”نیک سنگریہی تر اکھڑاگ آئے ہمتو ہیں“۔

اس لفظ میں جھنجھٹ اور جھیلے کا مفہوم پیدا ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ علم موسیقی میں مہارت نہ رکھنے والوں کے لئے ایک ملے جلے راگ کی قدر کرنا مشکل تھا اس لئے ان کم فہموں نے مذاق یا طنز کے طور پر ہر ایسی بات کو کھڑاگ کہنا شروع کر دیا۔ پھر اس میں بکھیر پڑے اور تکرار کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا اور کئی محاورے وجود میں آ گئے۔ راگ کی حیثیت سے تو اب شاید اس کا نام بھی نہیں لیا جاتا، گانا تو رہا ایک طرف، مگر یہ لفظ عام و خاص کی زبان پر ہے۔

ہم میں بہت ہوں گے جنہوں نے خاص کر دوالی کے تہوار پر صابونی نام کی ایک مٹھائی کھائی نہیں تو کبھی ضرور ہوگی۔ اس مٹھائی کا سفید رنگ اور گول شکل دیکھ کر لامحالہ خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس کو صابن سے نسبت ہے۔ کیونکہ دسی صابن سفید اور گول ہی بنا کرتا تھا۔ جو کپڑے دھونے کے کام میں آتا تھا۔ اگرچہ اب یورپ کی نقل میں لمبی لمبی بار بننے لگی ہیں۔ اس نام پر توجہ کیجئے گا تو یہ چیز سامنے آئے گی کہ چونکہ صابن مسلمانوں کے ساتھ آیا جو اس کے نام سے ثابت ہے اس لئے یہ مٹھائی ضرور مسلم عہد کی یادگار ہے، مگر بنتی ہندو تہوار پر ہے۔ پھر ہمارا خیال صابن کی طرف بھی ضرور متوجہ ہوگا کہ صابن کو ہم غسل میں استعمال نہ کرتے تھے۔ یہ کام ابٹن وغیرہ سے لیا جاتا تھا۔ نہانے کے لئے صابن کا استعمال ہنر مندوں سے سیکھا اور سفید اور گول شکل کے برصلاٹ اب مختلف رنگ و بو کی چکتیاں بننے کی وجہ صابن کا غسل کے لئے استعمال ہونا ہی ہے۔

لفظ کوتوال پر آپ اوپر نظر ڈال آئے ہیں۔ یہاں کوتوالی کے ساتھ لفظ چبوترہ کو بھی دیکھ لیجئے۔ چبوترہ کوتوالی کے ساتھ گویا مگر شامل ہوا اور پھر صرف چبوترہ چڑھنا بھی ایک محاورہ مستعمل رہا جس کا مفہوم رہٹا رہی تھا۔ پچھلے زمانہ میں کوتوالی کی عمارت میں چبوترہ عمارت کا خاص حصہ تھا جس پر کوتوال بیٹھ کر فرض منصبی ادا کرتا ہوگا۔ اس لئے چبوترہ اور انصاف یعنی پولس کا انتظام مترادف لفظ ہو گئے تھے۔ منہ کر سی آجانے اور نئی عمارتیں بننے سے بعض کوتوالیوں میں چبوترہ نہیں رہا۔ لیکن پرانے تھانوں اور خاص کر مضافات میں چبوترہ اب بھی کوتوالی کا خاص حصہ

ہے جس پر دیوانجی اور ان کا ڈگس علاقے کا انتظام کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

”کھرا کھیل فرخ آبادی“ یہ جملہ ایسا نہیں جو کسی نے سنا ہو۔ اس کی ترکیب پر نظر کر کے یہی سمجھا جائے گا کہ فرخ آباد میں کوئی کھرا کھیل کھیلا جاتا ہوگا۔ لیکن ہم اسے جس مفہوم میں بولتے سنتے ہیں اُسے اور فرخ آباد کے کھرا کھیل کو کوئی تعلق نہیں۔ ہم اس کو بولتے ہیں خوش معاملگی کے معنی میں۔ اب دیکھئے کہ کس محفنی طریق سے اس جملے میں ”اس بات دے اُس بات لے“ کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ کسی زمانہ میں فرخ آباد میں ٹکسال کٹی اور دہاں کا سکہ سب سے زیادہ کھرا سمجھا جاتا تھا۔ بالکل اُسی طرح جیسے آج انگلستان کی ہال مارک چاندی کھری سمجھی جاتی ہو اور ہر کھری بات کے لئے ہال مارک کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔

اورنگ زیب دکن پر فوج کشی کرتا ہے اور اس کی مدت غیر معمولی طویل ہو جاتی ہے جس کے سبب سے فوج میں ایک بیماری شروع ہو جاتی اور اکثروں کے ایک پھوڑا نکلتا ہے۔ لوگ اس کا نام اورنگزی پھوڑا رکھ دیتے ہیں۔ یہ لفظ آپ کے سامنے ایک پورے تاریخی واقعے کو پیش کر دینے کے ساتھ اس نفسیاتی حقیقت کو بھی پیش کرتا ہے کہ گھرا اور وطن سے طویل مدت تک دور رہنے کے باعث لوگ اورنگزیب سے بد دل ہو گئے تھے، اور یہی نفسیاتی وجہ تھی کہ اس پھوڑے کو انھوں نے اورنگزیب کی عنایت سمجھ کر اُس سے منسوب کر دیا۔

محمد شاہ کے عہد میں کوئی داؤد خاں صاحب حج کے لئے گئے اور وہاں سے مصری گہیوں کی سوغات لائے اس کی زراعت بڑھی تو لانے والے کے نام پر اُس کو داؤد خانی گہیوں کہا گیا۔

لفظ کناگت پر غور کیجئے تو نظر آتا ہے کہ صحیح لفظ کوناگت تھا اور کرن اور آگت سے مرکب ہے۔ کرن ایک راجہ کا نام تھا اور آگت کے معنی ہیں سامنے آنا۔ شرآدھ کی رسم کو راجہ کرن نے کسی خصوصیت سے ادا کیا تو اُسے کوناگت کہنے لگے اور پھر رے گھر کوناگت رہ گیا۔

لغت دیکھنے میں آپ کی نظر لفظ سابقہ پر بھی پڑے گی۔ اس کے عربی معنی ہیں پہلا لینے اگلے زمانے کا۔ اردو میں اس کا مفہوم ہو گیا اگلی جان پہچان اور واسطہ و معاملہ۔ اسی پر سے سابقہ پڑنا وجود میں آیا۔ مگر دیکھئے تو کہ اس مفہوم کو اصل معنی سے کیا مناسبت ہے!

عمورتوں کی زبان کا ایک محاورہ ہے ”شہر شملہ“۔ اسے دیکھ کر یقیناً ہمارے ذہن اس پہاڑ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جہاں ہائسراے گرمیاں بسر کرنے چلے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہمارے بہت سے دربار دار عجوار بھی مگر اس سے مراد وہ شہر ہے جہاں مروت و محبت مقفود ہو اب آپ اس جستجو پر مجبور ہوں گے کہ آیا شملہ کے لوگ بے مروت ہوتے ہیں یا صرف ایک استعارہ ہے وہاں کی سردی اور برف سے۔

زبان کا زبان کی طرح مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ عام زبان اور اس کی لغت و قواعد سے باہر

مقامی طور پر کچھ الفاظ، محاورے اور مثلیں استعمال ہوتی ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جو الفاظ اس زبان کے ادب یعنی کتاب میں آجاتے ہیں وہ پھیل بھی جاتے ہیں۔ ہماری زبان میں مقامی تاریخیں اور افراد کی سوانح عمریاں بہت کم لکھی گئیں۔ اس لئے یہ مقامی سرمایہ لغت بیکار ہی رہا۔ اس کی مثال کے طور پر دو لفظ پیش کرتا ہوں جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ہماری لغت میں درج نہیں۔ نہ معلوم ایسا کتنا ذخیرہ ضایع ہو گیا۔ اس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ ہماری لغت نویسی افراد کی توجہ کا نتیجہ ہے جن کی نہ تو ساری ذمہ داری ادب و تاریخ پر نظر ہو سکتی ہے اور نہ ان کو اتنے ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔

حافظ رحمت خاں کی سوانح عمری میں چند سطروں میں روہیلکھنڈ کی ایک تحریک کا ذکر ”مفتی تحریک“ کے نام سے آیا ہے۔ جو حکومت کے خلاف ایک سیاسی تحریک تھی اور اس وقت کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ مگر اس کا حیرانہ بادوس ٹکس کی مخالفت بن گیا۔ یہ تحریک اپنوں ہی کے ہاتھوں ٹھنڈی ہو گئی۔ اب اگر یہ لفظ لغت میں داخل ہوا تو یہ تاریخی قصہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔

دوسرا لفظ ”ولسن گردی“ ہے جو ابھی تک کسی حوالے کے طور پر بھی نہیں آیا ہے۔ جس زمانہ میں صوبہ متحدہ کا ہائیکورٹ آگرے میں تھا۔ مدراس علاقے کے ایک نواب غاندان کے فرد دلاور جنگ احمد اللہ صاحب معروف بہ ڈنکا شاہ سیاحت کرتے ہوئے گوالیار پہنچے اور محراب شاہ صاحب قادری سے بیعت کر کے خرقہ خلافت سے ممتاز ہوئے۔ وہاں سے آگرے آئے اور مسلمان عمامہ معتقد ہو گئے تو شاہ صاحب نے جہاد پر بیعت لی۔ صدر نظامت میں اس وقت مسلمانوں کا غلبہ تھا اور دکن میں بھی مسلمان ہی مقتدر تھے۔ ان کے علاوہ شہر کے دوسرے عاید بھی بہت با اثر لوگ تھے۔ مسٹر ولسن جج تھے۔ حکومت بظن ہو گئی اور یہ تمام عمائد رشوت ستانی میں ماخوذ کئے گئے۔ اس کو آگرے میں ”ولسن گردی“ کہا گیا۔ اگرچہ رشوت ستانی کے الزام سے یہ سب لوگ بری ہو گئے۔

مثلاً ان چند الفاظ کے مطالعے میں آپ نے اپنی زندگی کی صراحت کے بعض دلچسپ مرتعے دیکھے، اپنی تاریخ کے بعض نکتوں کو ایک ایک لفظ میں محفوظ پایا اور الفاظ کے طلسم زار معانی کی بھی خاص سیر ہو گئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مطالعہ لغت کے سلسلے میں علم الحروف کا ایک دلچسپ پہلو بھی دیکھ لیں۔

ہائے مخلوط یا دو چشمی وہ تینے ہندی، ر سے لی ہے جو اپنی ذات سے کالعدم ہے۔ مگر دوسرے حروف کے ساتھ ملکر آزدیتی ہے۔ یہ ہائے مخلوط یعنی ہا جھ کی مفرد آواز سنسکرت میں یا تو وزن کی خاطر زائد آتی ہے یا کبھی ندر یا ظہور کے معنی دیتی ہے، اور اس کے ترکیبی معنی آواز کو پرگھٹ یعنی ظاہر کرنے والا یا گانے والے کی آواز کو جانے کے ہیں۔

یہ ہائے مخلوط جب حروف گانے کے ساتھ ملتی ہے تو اس کی آواز گھرا جھ ہوتی ہے جو ناگرمی حروف میں

چوتھا حرف صحیح ہے۔ سنسکرت لغت میں حرف گھ کا اصلی اور پہلا مفہوم اُس آواز سے ہے جس سے ”گھر گھر“ اور گھڑا گھڑا ایٹ (مطلق آواز) جس میں گھنٹے گھنٹے بجنے کی آواز کا پہلو بھی ہے، وجود میں آئے۔ اس کے دوسرے معنی گھٹ یعنی بظون کے ہیں جس سے گھڑا اور پھر قطریا دور کی مناسبت سے گھاگرا وغیرہ ہے۔ گہ آ اور ھ دو آوازیں بلکہ گھ آ کی آواز دیتی ہیں۔ گہ آ کے لغوی معنی ہیں گانا، جانا، اور روانی۔ پھر اسی سے اصطلاحی مفہوم گانے والا یا دیوتا کے گیت گانے والا پیدا ہو گیا۔ اُسی طرح جیسے اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے اور بیسیوں مفہوم معجزے کی طرح وجود میں آ گئے اور گمن، گم، گونا، جانا اور جاترا وغیرہ کی اصل بھی یہی حرف ہے کیونکہ گات اور جیم ہر زبان میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ مصدر جانا سے گیا ماضی مطلق کا صیغہ اسی قاعدے سے بنا ہے۔ دریا کا چڑھنا اور اترنا، گانے کے اُتار چڑھاؤ کا مفہوم ہال اُڑ جانا اور اُڑ جانا کے معنی بھی اسی حرف کا اعجاز ہے۔ گنگا کی اصل بھی یہی حرف مانا گیا ہے، کیونکہ اس میں روانی ہے۔ گریہ یا گانٹھ سے سلسلہ چڑ جانے کے معنی کا ذمہ دار بھی یہی حرف ہے، اس لئے کہ اس میں بھی تسلسل و روانی ہے۔

بنابریں، حرف گات سے جتنے لفظ بنیں اور ان کے اندر روانی یا سر کی کیفیت کا مفہوم ہو تو وہ اسی اصل پر تصور کیے جائیں گے اور اس سے بنے ہوئے تمام الفاظ میں اس کے اصل لغوی مفہوم سے نسبت باقی رہے گی۔ مثلاً گج (بامحقی) گجر، گد گدی، گدھا، گڈا سا وغیرہ میں حرکت و روانی موجود ہے، اور گیت، گٹکری، گرجنا، گڑا گڑاٹ وغیرہ میں آواز کی مناسبت باقی ہے اور دریا کے بہنے میں چونکہ تری کا مفہوم ہے اس لئے گیلہ، گارا وغیرہ بھی اصل سے جدا نہیں ہیں۔

گہ آ اور گھ آ، مفرد و مرکب حرف کے لغوی معنی کی یہ مثالیں اور تصریح یقیناً غیر دلچسپ نہ تھی۔ اب صوتیات کے اعتبار سے اس کے مخرج پر بھی غور فرمائیے :-

سنسکرت مخارج کے اعتبار سے یہ دونوں آوازیں کنٹھی یعنی حلقی حروف ہیں۔ لیکن حشادیکھے گا تو ”گہ“ کے مقابلے میں ”گھ“ گڑھے میں پڑا محسوس ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے جتنے لفظ بنے یا محاورے پیدا ہوئے ان کے اندر معنایاً اس حرکت کے خالصتے کا مفہوم موجود ہے۔ مثلاً گہرائی، نشیب اور ڈھلاؤ کا مفہوم جیسے گھاٹ، گھاٹی، گھاؤ، گھائل، گھالنا، گھائی وغیرہ میں، یا پکڑ، گولائی، اور دور کا مفہوم جیسے گھونگا، گھونگھٹ، گھیر گھنڈی، گھنکرو، گھماؤ، گھونٹنا، گھونسا وغیرہ میں۔ یا گھر گھر خراٹوں کی آواز، گھڑ گھڑ (مطلق آواز) کا مفہوم جیسے گھٹنا اور گھنگی وغیرہ میں۔ یا رگڑ اور خراش کا مفہوم جیسے گھستا، گھسیٹنا گھیتلا وغیرہ میں۔ یا زیادتی اور بہتات کا مفہوم جیسے گھنا، گھمسان، گھان، گھنچا، گھنگھور وغیرہ میں باقوت و تنگی کا مفہوم جیسے گھاٹا، گھڑی وغیرہ میں، یا بستگی و غلاطت کا مفہوم جیسے (دل، دم) گھٹنا، گھمس، گھورا، گھن، گھونٹ وغیرہ میں۔ یا تحدید و انحصار کا مفہوم جیسے گھر، گھٹا وغیرہ میں۔ یا

اختیار و پنہانی کا مفہوم جیسے گھٹ، گھات، گھٹن، گھٹا وغیرہ میں۔ یا میل اور آمیزش کا مفہوم جیسے گھولنا، گھولوا، گھلچ پچ وغیرہ میں۔ یا ضرب اور چوٹ لگانے کا مفہوم جیسے گھڑنا، گھڑیا وغیرہ میں۔

مثالیں بہت لائی جاسکتی تھیں لیکن آپ اگر مطالعے کی توجہ فرمائیں گے تو اس سے بنے ہوئے ہر لفظ سے واضح ہوگا کہ کوئی حرف اپنی اصل اور مادے اور لغوی مفہوم سے حرکات، سکانات، کنایات، نیز مختلف صورتوں میں بدل جانے کے بعد بھی، جدا نہیں ہو جاتا، اور اپنی ہیئت اولے کو برا بھلا ہر کراتار ہوتا ہے۔

اسی ایک حرف کا طلسم معانی و مفہوم کھولے جانے کے لئے ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ اگر سوچئے کہ انسانی ذہن و خیال میں یہ حرف آیا کیونکر تو قیاس بتائے گا کہ یا تو جانور کو ذبح کرتے وقت یا جنگ میں کٹے ہوئے گلے کی گھر گھر کی آواز سے آیا، یا آبشار کے پانی کو گرتا دیکھ کر اس کی آواز نے سمجھایا، یا زنگے میں گھر جانے کے وقت خیال نے اسے ایجاد کیا، کیونکہ اس کے مفہوم میں یہ تینوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

میرا یہ دعا کہ مطالعہ لغت نہایت دلچسپ مشغلہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان اشاروں سے روشن اور مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کتنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے، مجھے کہنا پڑتا ہے کہ علمی افادے کے اعتبار سے ہماری لغت کی کتابیں مایوس کن ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ علم کی انتہا نہیں اور حصول علم کے لئے ایک انسانی عمر کافی ہے، ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ علم کی آرزو ہمیشہ جوان رہتی، بلکہ جوان تر ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس زمانے میں علوم و فنون کے اندر جس تیزی سے ترقیاں اور تبدیلیاں ہو رہی ہیں ہم اس سے بھی بے خبر نہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ علمی معلومات کو عام اور آسان کرنے کے لئے یورپ کی قومیں کتنا عظیم الشان کام کر رہی ہیں اور یورپ کی ہر زبان میں لغت کی کتابیں نئے نئے انداز پر اور جدید تر نقشوں پر برابر اور کثرت سے البتہ ہوتی رہتی ہیں۔ انگلستان کا سربراہ بڑا ادبی مفکر ایچ جی ویلس اب اس پر اٹل ہے کہ علوم کی ایک عالمگیر انسائیکلو پیڈیا مرتب کرے۔ ان حالات کے مقابلے میں ہماری لغت نویسی کی حالت پر اظہار خیال فضول سی بات ہے۔ ہماری لغات علمی معلومات بہم پہنچانے سے قاصر ہیں۔

پچیس سال پہلے جب ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جن کو ہم بے حقیقت سمجھتے ہیں انسائیکلو پیڈیا چھوڑیں آگئی تو ہمیں بھی توجہ ہوئی تھی، لیکن آج تک خیال ہی کی صورت میں ہے۔ حال میں انجمن ترقی اردو نے اسٹینڈرڈ ڈکشنری شائع کر کے بہت بڑا کام اور ایک اہم ضرورت ہی پوری نہیں کی بلکہ اردو زبان کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ اور اس کا عظیم واہم کے لئے ارباب انجمن مبارکباد و تحسین کے مستحق ہیں اور اس سے بڑا کام وہ ہے جس میں انجمن آج کل مصروف ہے یعنی ایک جامع اور مستند لغت کی طیاری۔ اس موقع پر میں ارباب انجمن کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان کی اسکیم میں اگر علمی معلومات کو اس لغت میں شامل کر دینا بھی ہو تو ہماری زبان میں عظیم الشان اضافہ

ہوگا اور ہماری قوم کی علمی جستجو کی تسکین کا ایک سامان ہو جائے گا۔ اگر ارباب انجمن مختلف علمی موضوعات پر اس علم کے جاننے والوں سے، انگریزی لغات ہی کے اندر سے، غیر فنی زبان میں ترجمے کرنا شامل کر سکے تو یہ لغت عام کتب لغت اور ایک دائرۃ المعارف کے درمیان کی کڑی ثابت ہوگی اور اسوقت ہماری قوم اور ہماری زبان کو اسی کی بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے سامنے چھوٹے چھوٹے اور عام فہم ایسے مضامین آجائیں جن کو پڑھ کر ہم آریات قبل تاریخ کو پڑھنے بغیر اتنا جان جائیں کہ انسان کی ابتدا کتنی حقیر تھی اور اس کی تکمیل میں کتنا زمانہ لگا ہے۔ ہم جان جائیں کہ علم زبان کمال ہو کر کس طرح علوم فطرت سے متعلق ہو گیا اور اس کے اندر علوم فطرت کی کتنی قلعیت آگئی ہے۔ ہم سمجھ سکیں کہ تاریخ نویسی کے اصول اور طریقے کس نہج سے مستحکم ہوئے ہیں۔ ہم دیکھ سکیں کہ جرثومات کی تحقیق نے فن طب کے لئے کیسے یقینی ذرائع بہم پہنچا دیئے ہیں ہمیں معلوم ہو کہ علم الاعضاء کی ترقی نے جراحی کے برحمانہ فن کو کس درجہ راحت آفریں بنا دیا ہے۔ ہم دیکھ سکیں کہ اعصاب کا علم معجزے کی حد تک کس نوع سے مرتب و منظم ہوا ہے۔ ہمیں علم ہو سکے کہ صنعت و حرفت یعنی مشین کی ترقی نے انسان کی زندگی میں کتنی اور کیسی عجیب و غریب تبدیلیاں کر دی ہیں ہمیں معلوم ہو سکے کہ میٹر، موٹر کشتی اور ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کس حد تک پہنچ گئی اور کس نے پہنچائی ہے۔ ہم جان سکیں کہ مختلف زبانوں کے مشہور و مستند مصنف کون تھے اور کس کی کونسی کتاب اہم واسطے ترین ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عام علمی معلومات بڑھانے اور ان کی تہ اور اصل تک پہنچنے کے لئے لغت کا مطالعہ بے حد دلچسپ اور مفید شغل ہے، جو ایک اہل قلم کی تو اشد ترین ضرورت ہے اور ہماری کتب لغت میں جو کمی ہے، ہمارا قومی و علمی فرض ہے کہ ہم اس طرف متوجہ ہو کر علوم کے مبادیات کا اس میں ضرور اضافہ کر دیں تاکہ اس طرح افراد قوم میں علم کی اشاعت ممکن ہو جائے۔

ل۔ احمد

ہمیشہ پاد لے کے

کہ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا موصول پہنچ گنا وصول کرتا ہے اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

مینجر ”ننگار“

معراج تمدن

یا اشتراکیت

ہندوستان کے بلند پایہ رسالہ نگار کی دو قریبی اشاعتوں میں اشتراکیت کے متعلق ایک مدلل مقالہ شائع ہوا ہے جس سے انتہا پسند طبقہ میں جو اس وقت ہندوستان کی بیداری میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ غلط فہمی پیدا ہو جانے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ اس لئے میں اس مسئلہ پر نگاہ ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے نہ اشتراکیت کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور نہ کسی اشتراکی سے ان کو تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے۔ ورنہ وہ ناگزیر اشتراکیت کو اشتراکیت کے ساتھ ملا کر نہ دیکھتے۔ موجودہ روس و جرمن معاہدہ اس وجہ سے وجود میں نہیں آیا کہ دونوں ملکوں کے طریقہ حکومت میں ہم آہنگی ہے۔ بلکہ یہ ہٹلر کا ایک سیاسی تجربہ ہے جو صرف اٹالین ہی کے زمانہ میں روس کے اندر کامیاب ہو سکتا تھا۔

معنی کے لحاظ سے جمہوریت و اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی عوام کی اپنی حکومت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے جمہوریت کا مفہوم ”آزادانہ حقوق رائے دہندگی“ کی حد تک محدود کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ جمہوریت سے مراد ”عوام کی منتخب حکومت“ ہے اسی کے ساتھ ایک خاص ملک کی مثال پیش کر کے جمہوریت کو رحمت الہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی دلائل تشنہ تشریح ہیں۔ جس ملک کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہاں افراد کے مفاد ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ آزادی افراد سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی چند سوامیرالائرا کا دائرہ اثر اس قدر وسیع ہے کہ افراد کی آزادی خیال اس میں جذب ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ شہنشاہیت پر حسن کی ستر آفرینیوں کو ترجیح دینے والے ڈیوک آف وڈسٹر کا جو حشر ہوا وہ اسی جاہ پسند طبقہ کا کارنامہ تھا۔

ایک تازہ مثال سے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داروں کے دست ٹر ہو جانے کی وجہ سے افراد

کی ذہنی قوت کس حد تک سلب ہو جاتی ہے۔

پنجاب کونسل میں "قانون حق آراضی مرہونہ بلا معاوضہ" زیر بحث تھا، جس کی رو سے اکثر کسانوں کو ان کی مرہونہ زمین بلا معاوضہ واپس مل جانے والی تھی، لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہ سرمایہ داروں کے غلام تھے سکندر منسٹری کو برا کہہ رہے تھے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ دولت مخصوص آدمیوں کے ہاتھ میں ہے اور بغیر دولت کی مساویانہ تقسیم کے عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو سکتا۔ شخصی آزادی جس کی حمایت میں مقالہ نگار نے اشتمالیت پر الزام لگا کر اسے ہوا دکھانے کی سعی کی ہے۔ اس پر اسے نام جمہوریت میں ہے کہاں؟ جس کے چھین جانے یا چھین لئے جانے کا خطرہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ عوام کی دماغی سلج کو ایک کسٹ بچہ کی مانند سمجھ کر اصلی موٹر کی بجائے جاپانی کھلونا موٹر دے کر بہلانے کی کوشش کریں۔

آپ جس جمہوریت کی شناخانی فرما رہے ہیں اس کی حالت بالکل ایسی ہے، جیسے ایک گاؤں کے پنشن یافتہ سپاہی نے ہرن کا شکار کیا، جسے شکاری کتوں نے پکڑا تھا۔ اس کی رانوں اور سینہ کا نفیس گوشت تو اُسی وقت ایک معتبر آدمی کے ہاتھ کلکٹر ضلع کو بھیج دیا گیا۔ سرچوکیدار کے حواسے کیا گیا کہ تحصیلدار کو پہنچائے، کھال اُتر واکر علاقہ کے ذیلدار کے لئے ایک مقام پر محفوظ رکھ دی گئی۔ باقی جسم کا گوشت نمبر دار اور پٹواری کو دینے کے بعد شکاری کے دوستوں میں تقسیم ہوا اور کتوں کو صرف وہ ہڈیاں ملیں جو پکا ہوا گوشت کھانے کے بعد ان کی طرف پھینکی گئی تھیں ملاحظہ فرمائیے۔ سب اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے؟ حالانکہ شکاری کو کسی نے ایسا کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔

متذکرہ تمثیل سے مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ بغیر اقتصادی مساوات کے آزادی آراء لغو و جہل چیز ہے اور حکومت امراء کو جمہوریت کا طلسم خیز نام دیکر عوام کو مغالطہ میں ڈالنا چاہا ہے۔ کیا اشتراکیت، دنیا کے تمدن کے لئے ناممکن العمل نظریہ ہے۔ زمانہ حال کے جمہوریت پسند فیلسوفوں کا دماغ اس باب میں شبہات کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ کیونکہ طبقہ امراء اشتراکیت کی ہمہ گیر مقبولیت کو دیکھ کر اپنے قارونی خزانے کی طرف سے غیر مطمئن ہے اور ان کا یہ خوف بے وجہ بھی نہیں ہے۔

افلاس کیا ہے؟ ضروریات زندگی کی عدم فراہمی۔ امارت کیا ہے؟ لوازم زندگی کا بافراط پانا جانا۔ اور اشتراکیت ان دونوں میں توازن پیدا کر دیتا چاہتی ہے یعنی ریاست کے تمام ذرائع آمدنی پر قابض ہو کر ہر شخص کو بلحاظ ضرورت تقسیم کر دے، جمہوریت میں روسا جائز و ناجائز ہر طرح دولت پر قابو حاصل کر لیتے ہیں اور اشتراکیت میں دولت سب کی ضرورت کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے، جمہوریت میں دونوں گروہ غیر مطمئن رہتے ہیں، لوٹنے والے

لوٹے ہوئے مال کے تحفظ کے لئے اور لوٹے جانے والے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے، برخلاف اسکے اشتراکیت کی بنیاد ہی معاشی و اقتصادی اطمینان پر قائم ہے جس میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

اشتراکیت پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت یکسانیت کو پسند نہیں کرتی اور افراد کی ضروریات زندگی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ انسانی طبائع کا اختلاف فطری بات نہیں ہے بلکہ ماحول کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے مختلف طبائع رکھنے والے افراد کا بھی ایک مقصد کی خاطر متحدہ محاذ قائم کر لینا دشوار نہیں۔ ڈاکو اور لیڈرے ایک دوسرے کے عزیز نہیں ہوتے اور ان کی فطرتوں میں بھی فرق پایا جاتا ہے، تاہم نوٹ لکھسوٹ کی خاطر ان میں بھی وقتی یا دائمی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، الغرض طبائع انسانی کا اختلاف اشتراکیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ جمہوریت پسند لوگ نظام جمہوریت کے پروپاگنڈا میں آزادی افراد کو بہت نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزادی جس چیز کا نام ہے وہ جمہوریت میں مفقود ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ کامیاب دھوکا مذہبی آزادی کے نام سے دیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معاشی الجھنوں میں پھنس کر کوئی فرد مذہبی فرائض کی بجا آوری میں کامیاب ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود اپنی ہستی کے وجود کا احساس بھی برائے نام رہ جاتا ہے۔ اس لئے ایسی حالت میں مذہبی آزادی کا ذکر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ مذہبی آزادی سے قیام سرمایہ داری کو اور مضبوط بنانے میں کام لیا جاتا ہے۔ بانیان مذاہب نے مذہب کی بنیاد رحم انصاف - رواداری اور مساوات پر قائم کی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ اسلام اور اشتراکیت میں تو کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ لیکن کیا جمہوریت میں اہل مذاہب کو وہی حقیقی مساوات و آزادی حاصل ہے جو مذہب کا مقصود ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اشتراکیت جمہوریت سے کہیں زیادہ مقاصد مذہب کو پورا کر سکتی ہے۔ مذہبی آزادی کے بعد جس دوسری برکت کا ذکر جمہوریت میں کیا جاتا ہے وہ معاشرت کی آزادی ہے، حالانکہ جمہوریت میں صرف طبقہ امرا اور سرمایہ دار گروہ نظام معاشرت کا دھندلا جا رہا ہے اور عوام کو صرف "معاشرتی آزادی" کے خوبصورت الفاظ سے مطمئن کر دیا جاتا ہے، حالانکہ معاشرتی آزادی اور معاشرتی مساوات میں زمین و آسمان کا فرق ہے معاشرتی مساوات کے مطالبہ پر مذہب کا اثر ڈال کر عوام کو اپنی حالت پر قانع رہنے کی تلقین کی جاتی ہے تاکہ سرمایہ دار تھوڑا بہت دیگر عوام سے سجدہ عبودیت حاصل کرتے رہیں دراصل اس مسئلہ کو قدیم بانیان مذاہب نے ضرور حل کر دیا ہوتا۔ لیکن اُس زمانہ میں انفرادی منافع نے اتنی بھیانک اور گھناؤنی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ذرائع آمد و رفت محدود تھے مشینیں اور کلیں مفقود تھیں اور بین الاقوامی تجارت کی کوئی صورت قائم نہ تھی، لیکن اب کہ انسانی تمدن اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا ہے، اجتماعی تمدن کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اگر جمہوریت اس مسئلہ کو پس پشت ڈال کر معاشرتی آزادی کا رنگ الپتی ہے تو وہ لوگوں کو دھوکا دیتی ہے۔ معاشرتی

آزادی بغیر معاشری مساوات کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر ایک شخص کو فاقہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں معاشری آزادی کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے تو جمہوریت بیشک اس میں کامیاب ہے، لیکن اگر اقتصادی نظام کی استواری میں عوام کی مساویانہ شراکتے بغیر معاشرت کا کوئی مفہوم متعین نہیں ہو سکتا، تو پھر جمہوریت کا یہ دعویٰ کہ اس نے ہر شخص کی معاشرت کو آزاد کر رکھا ہے، جمہوریت کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔

تیسری برکت جس کا ذکر جمہوریت پسند طبقہ کیا کرتا ہے - آزادی رائے ہے۔ یعنی جمہوریت میں ہر شخص آزادی سے رائے دے سکتا ہے لیکن اس کا کھوکھلا پن شروع ہی میں دکھا دیا گیا ہے۔ سرمایہ داروں کے ساتھ عوام کے مفاد اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کی رائے کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ اقتصادی مجبوریوں صحیح اظہار رائے سے باز رکھتی ہیں۔ چوتھی چیز آزادی حرکت و عمل ہے۔ جمہوریت پسندوں کا اشتراکیت پر یہ اتہام ہے کہ وہ شخصی آزادی کو سلب کر لیتی ہے یعنی اس میں افراد کا کوئی شمار نہیں رہتا لیکن اس میں مطلق صحت کو دخل نہیں ہے۔ یہ لوگ افراد کا نقطہ بول کو صرف اپنی ذات کو مراد دیتے ہیں، پس یہ تو بالکل صحیح ہے کہ اشتراکیت میں سرمایہ دار افراد کو افراد قوم میں شمار نہیں کیا جاتا اور ان کی حرکت و عمل کی آزادی کو صرف اس لئے سلب کیا جاتا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی کو آزادی نصیب ہو اگر چند افراد کے ظلم کو ختم کر دینے سے لاکھوں ہندوؤں کو آزاد کر آزادی مل سکتی ہے تو اسے کون برا کہہ سکتا ہے۔ کامیاب جمہوریت نامور اور محنت کش طبقہ کو افراد میں شمار نہیں کرتے۔ افراد سے ان کا مفہوم اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ کون نہیں جانتا کہ جمہوری نظام میں زیادہ سے زیادہ دس فی ہزار افراد فارغ البال کہے جاسکتے ہیں اور یہی دس فیصدی باقی نوے فیصدی افراد کے مجلسی، اخلاقی اور سیاسی حقوق پر مختلف ذریعوں سے غاصبانہ قبضہ کرتے رکھتے ہیں۔ ایسی آزادی کو برقرار رکھنا یا رہنے دینا انسانی خود داری کی انتہائی قوی ہے۔

جمہوریت پسند جماعت، اشتراکیت پر یہ الزام بھی ظلم کرتی ہے کہ اس میں ذہنی آزادی محدود ہو جاتی ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ اعتراض ایک لمحہ اپنی جگہ نہیں ٹھہر سکتا، اس وقت سب سے کھلی ہوئی مثال ہمارے سامنے روس کی موجود ہے کہ وہاں کے دو با اشتراکیت نے کتنی عظیم الشان ذہنی آزادی و ترقی کا ثبوت دیا ہے۔ تمدن انسانی کا کونسا پہلو ایسا ہے جس میں روس نے نہایت ہی قلیل مدت میں انتہائی ترقی نہ کی ہو۔

ذہنی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اقتصادی اطمینان ہے اور اشتراکیت میں سب سے پہلے یہی اطمینان کیا جاتا ہے۔ جمہوریت میں اس کا مکمل تو ہے کہ طبقہ مراعات کے لوگ یا سرمایہ دار افراد غیر معمولی ذہنی ترقی کر سکیں، لیکن عام ذہنی ترقی و ترقی کا اس میں امکان نہیں، برعکس اس کے اشتراکیت میں سب کو ذہنی ترقی کا برابر موقع دیا جاتا ہے۔ فرض اشتراکیت کے مقابلہ میں جمہوریت کو نوع انسانی کے لئے زیادہ مفید سمجھنا، اس قدر عجیب بات ہے کہ جب تک واقعات و حقائق کی طرف سے آنکھ بند کر لی جائے اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

عربی زبان اور ادب کی مختصر تاریخ

قوت گویائی انسان کی ایک اہم ترین صفت ہے، جس کے بغیر وہ اپنی تمدنی اور معاشرتی مشکلات حل نہیں کر سکتا، معاشرت انسانی کی مختلف ضرورتوں کے اعتبار سے جب کوئی زبان عالم وجود میں آتی ہے تو جس طرح ابتدا میں معاشرت کے طریقے سیدھے سادے اور بے تکلف ہوتے ہیں اُسی طرح زبان شروع شروع نہایت سادے لباس میں جلوہ نما ہوتی ہے مبالغہ اور مضمون آفرینی کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، تشبیہات و استعارات شاذ و نادر کہیں کہیں آجاتے ہیں، جس مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے اُس کو بغیر کسی ایچ نیچ کے بے تکلف ادا کر دیا جاتا ہے، لیکن جوں جوں معاشرت کے طریقے وسیع ہوتے جاتے ہیں، سامان زندگی میں تکلفات پیدا ہوتے جاتے ہیں، نفاست و لطافت بڑھتی جاتی ہے اور اُسی قدر زبان بھی تمدنی کے ساتھ ساتھ عروج کرتی جاتی ہے، الفاظ میں تراش خراش پیدا ہو جاتی ہے، استعارات و تشبیہات میں نزاکت اور رنگینی آ جاتی ہے، مبالغہ میں زور اور مضمون نگاری میں ترقی ہو جاتی ہے۔

عربی زبان میں جاہلیت کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوہ و صحرا، دشت و بیاباں، دشوار گزار راستے اور مٹے ہوئے کھنڈر اُن کے ادبی ذوق کے جولانگاہ تھے، لیکن یہی بادیہ بیابان جب حکومت اور دولت کے منصب پر فائز ہوئے تو اُن کے کلام میں دقت آفرینی اور رنگیں بیانی کی کوئی حد نہیں رہی، جس کا صحیح اندازہ متنبی، ابونواس، بحرّی اور ابونمام وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

چونکہ اسلام سے قبل عربوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ نہ تھا اس لئے عربی زبان کی تاریخ آفرینش کا پتہ نہیں لگتا اور یہ صحیح طور پر بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کس زبان سے نکلی ہے، لیکن دنیا کی اور زبانوں کی طرح عربی زبان نے بھی بڑے بڑے پلٹے کھائے ہیں خصوصاً گزشتہ صدی کے وسط میں علوم جدیدہ کا ایسا زہر دست سیلاب آیا جس کی وجہ سے صد ہا جدید اصطلاحات علمیہ وضع ہوئیں اور ہزار ہا انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی الفاظ کا اضافہ کرنا پڑا۔

اس زمانہ میں عربی زبان کے اندر الفاظ کا جو اضافہ ہوا وہ دو قسم کا ہے ایک تو وہ الفاظ جو غیر زبان سے عربی میں داخل ہوئے جیسے لغزات، بنطلون، بروجرام، واپور اور فونوگراف وغیرہ دوسرے وہ جو جدید علوم، جدید آلات

دایجادات کے لئے خود زبان عربی کے الفاظ ان معانی کے مقابلہ میں پیدا ہو گئے، جیسے جریدہ، مجلہ، مدیر، کلیہ، رسمیت اور وسام، وغیرہ۔

تدوین عربی زبان پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ جاہلیت میں کسی کلام کی جانچ پر تال کے لئے کچھ قواعد مقرر نہ تھے بلکہ کسی کلام کے حسن و قبح کی دیکھ بھال ان طبعی اور فطری اصول پر کی جاتی تھی جو قدرت نے ہر سخن فہم اور دقیقہ سنج طبیعت کو عنایت فرمائے ہیں۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے اہل عرب کی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا اور عرب و عجم کے اختلاط و ارتباط کا اثر زبان پر بھی پڑنے لگا تو علماء کرام کو اس بات کا اندیشہ محسوس ہوا کہ عربی زبان دوسری مختلف زبانوں کی آمیزش سے بگڑ کر کوئی نئی صورت نہ اختیار کر لے، اس لئے سب سے پہلے حضرت علی نے اپنے تتبع اور استقراء سے چند قواعد لکھے اور ابوالاسود دہلی کو حکم دیا کہ وہ اسی نہج پر قواعد کی تدوین کریں، چنانچہ انھوں نے اس مہتمم بالشان کام کا آغاز کیا، اور اسی بنیاد پر پھر عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ علامہ ابن خلدون نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:-

اول من کتب فیہا ابوالاسود الدہلی من
بنی کلماتہ و یقال بإشارة علی۔

ابوالاسود دہلی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر لکھا کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت علی کے اشارے سے یہ کیا تھا

(مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ۱۸۸۸ء)

کتابی شکل میں اصول و قواعد سب سے پہلے علامہ جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ) نے ایک تصنیف میں پیش کئے جس کا نام ”کتاب البیان والبتین“ ہے، اس کتاب کا دوسرا نام ”البتین والبتیان“ بھی ہے۔ جاحظ اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل اور انشاء پر داڑ تھا، لوگ اُس کو ادبِ عرب کا سردار اور فصاحت و بلاغت کا امام مانتے ہیں، اربابِ علم و ادب میں شاید ہی کوئی اُس کے مرتبہ کو پہونچا ہو، اُس نے یوں تو مختلف فنون میں بہت سی بے نظیر کتابیں لکھی ہیں، لیکن ”البيان والبتین“ سے اُن کو کوئی نسبت نہیں، یہ اپنے موضوع کی سب سے بہتر اور اچھوتی کتاب ہے اس میں خطباء اور شعراء کا کلام، دلچسپ حکایات و لطائف اور مواعظ کے نمونے بڑی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے علم ادب پر بحث کرتے ہوئے جن چار کتابوں کو اس فن کا ماخذ قرار دیا ہے اُن میں سے ایک ”کتاب البیان والبتین“ بھی ہے۔

اسی صدی ہجری میں عبداللہ بن المعتز عباسی (المتوفی ۲۹۶ھ) بھی تھا، یہ بھی اپنے عہد کا بہت بڑا نازک خیال اور بیغ شاعر تھا، اُس نے بھی علم و ادب پر چند کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ”کتاب البدیع“ سب سے زیادہ مشہور ہے، یہ فن بدیع میں سب سے پہلی کتاب ہے علامہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب ”تاریخ آداب اللغة العربیہ“ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کتاب البدیع کا ایک نسخہ اب تک کتب خانہ اسکوریاں میں موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ”قدامہ ابن جعفر بغدادی (المتوفی ۳۱۰ھ) نے تنقید و نظم پر سب سے پہلے ”نقد الشعر“ اور ”نقد النثر“ دو مستقل کتابیں لکھیں جن میں سے ”نقد الشعر“ زیادہ مقبول ہوئی جو آج کل بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔

اس کتاب میں نہایت خوبی سے شعر کی تعریف کی گئی ہے اور لفظ و معنی کی باہمی ترکیب کے اعتبار سے شرائط نظم مفصل بیان کئے گئے ہیں۔ قدامہ نے اور بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا ذکر صاحب الفہرست نے صفحہ ۱۳۰ میں کیا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد ابوہلال عسکری (المتوفی ۳۹۴ھ) نے نثر و نظم کی تنقید کے سلسلہ میں ایک اور قیمتی کتاب تصنیف کی جس کا نام ”کتاب لصناعۃین“ ہے، اس کتاب میں نثر و نظم کے بلند پایہ انتخابات، چیدہ چیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہت ہی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک ایک مسئلہ کی متعدد مثالیں پیش کر کے فصاحت و بلاغت پر خوب خوب موثر گافیاں کی ہیں اور بتایا ہے کہ ایک خطیب یا مضمون نگار اپنے خطبہ یا مضمون میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔

مثلاً وہ اصول خطابت پر بحث کرتا ہوا بتاتا ہے کہ ایک مقرر کا فرض ہے کہ تقریر کرتے وقت اُس کا دل قوی اور مضبوط ہو، اعضاء ساکن اور مطمئن ہوں، زبان صاف اور شستہ ہو، آواز اچھی اور معتدل ہو، موقع اور محل کے مناسب مضامین کا انتخاب کر سکتا ہو، سامعین کے مذاق اور میلان طبع سے واقف ہو، امراء اور عوام کے مراتب کا لحاظ رکھتا ہو تاکہ اہل مجلس کے جذبات پر انگیزتہ ہو سکیں۔

پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن رشيق قيردانی (المتوفی ۴۵۶ھ) نے ایک نہایت ہی بیش بہا کتاب لکھی جس کا نام ”کتاب العمدۃ فی الشعر و نقدہ“ ہے، اس کتاب کا نام ہی اس کا عنوان ہے، اس موضوع پر اس سے پہلے قدامہ ابن جعفر اور ابوہلال عسکری وغیرہ نے گو قابل قدر کتابیں لکھیں مگر جس خوبی اور وضاحت سے کتاب العمدہ میں اشعار کی تنقید کی گئی ہے کسی اور کتاب میں اُس کی چوتھائی بھی نہیں، تنقید اشعار کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے اصول بلاغت منضبط کئے گئے ہیں، شعراء کی اصطلاحیں، اُن کے خاص خاص عنوانات اور باہمی مباحثے نظم و نثر کا مقابلہ، اُن پر تنقید و نکتہ چینی کے طریقے، لطایف و ظرایف، شعراء کے طبقات، اُن کے باہمی امتیازات اور وہ تمام اصول جو صحیح طور پر علم ادب کے لئے دستور العمل بننے کے قابل ہیں تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور آخر میں تنقید اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

خلاصہ یہ ہے کہ یہ فن اور اُس کا تعلم پورے طور پر کتاب العمدہ میں پایا جاتا ہے۔

و بالجملۃ ہذہ الصناعۃ و تعلمہا مستوفی فی کتاب العمدۃ لابن رشيق۔ (مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ۱۹۰۵ء)

اس دور کی آخری کڑی شیخ عبدالقادر جبرجانی (المتوفی ۱۱۸۷ھ) تھا، یہ شخص علم کلام، علم نحو، علم فقہ کا امام اور علم ادب کا مؤسس مانا جاتا ہے، اس نے صحیح معنوں میں عربی زبان اور عربی ادب کو جامہ تدوین سے آراستہ کیا، اس کے منشا پر اگندہ شیرازہ کو یکجا کر کے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ دو بیش بہا کتابیں لکھیں، جن میں بجائے عقلی دلائل وراہی ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی ادیبانہ انداز میں مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ دیکھو اس کلام میں جو کچھ زور ہے وہ محض اس لئے کہ فلاں لفظ فلاں جگہ پر ہے یا فلاں لفظ فلاں لفظ سے مقدم یا مؤخر ہے، اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے تو کلام میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی جو موجودہ حالت میں ہے۔

الفاظ کا باہمی تناسب اور ان کی نشست ہر کلمہ کی دوسرے کے ساتھ موزونیت اور کھپت فصاحت کی جان ہے، کبھی دو کلمے ہم معنی ہوتے ہیں مگر کسی عبارت یا شعر میں ایک ہی کلمہ کھپ سکتا ہے اگر اُس کے بجائے دوسرا کلمہ رکھ دیا جائے تو کلام میں بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کلام میں ایسے الفاظ جمع ہو جاتے ہیں جو باہم مناسبت رکھتے ہیں تو زبان میں خود بخود ان کے ادا کرنے میں ایک سلاست اور روانی پیدا ہو جاتی ہے جس کو فن بدیع کی اصطلاح میں الشبام کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ایک کلام دوسرے کلام پر فضیلت محض انتخاب الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اُس میں معنی کو بڑا دخل ہے، الفاظ سے جس قدر حصہ متعلق ہے اُس کو فصاحت کہتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق معنی سے ہے اُن کو بلاغت کہتے ہیں۔

غرض کہ صنعت لفظی اور معنوی اور اُن کے تمام اقسام شیخ نے اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ کسی شخص نے اب تک ان مسائل پر اتنی خوبی اور وضاحت سے خامہ فرسائی نہیں کی۔

چھٹی صدی ہجری تک متقدمین کا یہ مذاق باقی رہا، وہ علم ادب کے اصلی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ مسائل ادیبانہ انداز میں بیان کرتے رہے تاکہ متعلم کو خطابت و صحافت میں کافی دستگاہ حاصل ہو جائے اور وہ ہر موضوع پر تحریر و تقریر کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر سکے۔

لیکن افسوس ہے کہ ساتویں ہجری میں جب ابویعقوب یوسف سکاکی (المتوفی ۱۱۷۶ھ) کا دور آیا تو دریا کا رخ دوسری طرف پھر گیا، اُس نے علم ادب کو منطقی رنگ میں رنگ دیا اور اُس میں معقولات کا ایک بڑا طومار اضافہ کر دیا۔

متاخرین نے سکاکی کی کتاب "مفتاح العلوم" کو بہت سراہا، اُس کے متعدد خلاصے اور حاشیے لکھے گئے اور فلسفیانہ رنگ میں اس کثرت سے شرح و حواشی پڑھائے جانے لگے اور اصل فن کا کہیں پتہ نہیں رہا، جن میں خصوصیت کے ساتھ علامہ تفتازانی (المتوفی ۱۱۹۱ھ) کی تصنیفات مطول اور مختصر معانی سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور مدت سے درس نظامی میں داخل ہیں جو اس وقت ہندوستان کے زیادہ تر مشرقی وارس میں رائج ہے اور جس کی

تحصیل کے بغیر کوئی شخص عالم کہے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

زمانہ کی رفتار اور جدید مذاق کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام چیزیں بدلتی جا رہی ہیں لیکن ہمارا عربی نصاب تعلیم جو آج سے صدیوں پہلے فلسفہ و منطق کے عروج کے دور میں تیار کیا گیا تھا آج بھی بلا کسی ترمیم و ترمیم کے رائج ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عربی زبان باوجود ہماری مذہبی زبان اور ہمارے ذوق سے قریب تر ہونے کے ہم کو دلوں ویسی نہیں آتی، جیسی انگریزی زبان باوجود ایک اجنبی زبان ہونے کے تھوڑے عرصہ میں آجاتی ہے اسلئے کہ اُس میں زمانہ کے مطابق ایک روح ہوتی جس کا ہمارے یہاں کہیں نشان تک نہیں ملتا، یہ سب کچھ دراصل اُس بے نتیجہ طریقہ تعلیم کا اثر ہے جو بدقسمتی سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروج ہے، علماء کے اس جمود اور کورانہ تقلید پر عالم اسلامی جب قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔

سید جلیل الرحمن عظمیٰ

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف :- اردو ادب میں صاحب ”لالہ رخ“ کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھنے پونے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات :- اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جنے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک دجہ آفریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی نفاست و لطافت کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا از بس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل :- ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاحیت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ :- یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت از دواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

مینجر نگار لکھنؤ

اٹلی کی غیر جانبداری اور روس کی طرفداری کا راز

اس سے قبل عام خیال تھا کہ روم و برلن کے درمیان جو رشتہ اتحاد قائم ہو چکا ہے وہ اتنا زبردست ہے کہ ان میں سے اگر کوئی ایک بھی لڑائی پر آمادہ ہو تو دوسرا ضرور اس میں شریک سمجھا جائے گا، لیکن موجودہ جنگ میں جب اٹلی نے اعلان غیر جانبداری کیا تو لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کیا بات ہے۔ اس کے کئی سبب بیان کئے جاتے ہیں، بعض کا خیال یہ ہے کہ خود جرمنی نے اس کو شرکت جنگ سے باز رکھا تاکہ اس کے سواحل کے ذریعہ سے جرمنی کو خام پیداوار اور ذخائر حرب کی فراہمی ہوتی رہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کی فوجی تنظیم اچھی نہیں ہے اور اس سے قبل جب ہٹلر وہاں گیا تھا تو اس نے معلوم کر لیا تھا کہ اٹلی کی فوج بہت ناقص ہے اس لئے اس نے اٹلی کو شرکت جنگ سے اس لئے باز رکھا کہ کہیں خود اسی کو اٹلی کی مدد نہ کرنا پڑے اور دوسری مصیبت مول لینی پڑے۔ تیسرا سبب ایک اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ پولینڈ یا فرانس کے محاذ میں اٹلی کی مدد جرمنی چاہتا ہی نہیں اور نہ اٹلی کوئی مدد کر سکتا ہے، جرمنی تو صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ بحیرہ روم کو برطانیہ کے لئے خطرناک بنائے رکھے اور اپنی ساری قوت اس طرف صرف کر دے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں باتیں کسی نہ کسی حد تک صحیح ہوں، لیکن جس وقت ہم اس معاملہ کا اندرونی طور پر مطالعہ کرتے ہیں اور خود مسوئین کے ان بیانات کو دیکھتے ہوئے جو وقتاً فوقتاً اس سے قبل اس نے شائع کئے ہیں، تو اس کی غیر جانبداری کا ایک گہرا سبب اور بھی معلوم ہوتا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی، جرمنی اور جاپان کے درمیان روس کے خلاف ایک "اشتراکیت شکن" معاہدہ ہو چکا تھا اور یہ تینوں آمرانہ حیثیت رکھنے والی سلطنتیں اصول حکومت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متحد خیال بھی ہیں، لیکن چونکہ دنیا کی کوئی سامراجی حکومت خود غرضی سے خالی نہیں ہو سکتی اور وہ کبھی دوسرے کے لئے قربانیاں پیش نہیں کر سکتی، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ جرمنی اور روس کا اتحاد جاپان یا اٹلی کو خوش کرتا اور اسکا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اعلان جنگ ہوتے ہی ایک طرف جاپان نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف اٹلی نے۔

ان تینوں میں جو اتحاد قائم تھا وہ اسی لئے تھا کہ روس کی اشتراکیت کو بڑھنے نہ دیا جائے گا لیکن جب نازی حکومت نے اپنی خود غرضی کی بناء پر خود روس ہی کے ساتھ مصالحت کا ارادہ کر لیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جاپان اور اٹلی کے خود غرضانہ جذبات نہ ابھرتے اور وہ جرمنی کی مدد کرتے۔ پھر جاپان اور اطالیہ کی یہ برہمنی جرمنی کے خلاف کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ اس کے چند اور دیرینہ اسباب بھی تھے۔ جاپان اس کو اچھی طرح جانتا تھا کہ چین، جرمنی ہی کے ہوائی جہازوں اور ہوا بازوں کی مدد سے جاپان کا مقابلہ کر رہا ہے اور یہ جرمنی کی خفیہ مدد صرف اس لئے ہے کہ چین جو جرمن مال کی بڑی منڈی ہے، جاپان کے قبضہ میں نہ چلی جائے۔ بہر حال جاپان جرمنی کی طرف سے پہلے ہی کبیدہ تھا کہ روس کے ساتھ اس کے اتحاد نے ایک اور ضرب لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔

رہ گیا اٹلی سنو وہ بھی نازی حکومت کی دست درازیوں کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتا تھا، چنانچہ جب وقت جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کیا تو مسولینی نے صاف صاف کہہ دیا کہ رائن لینڈ کی سرحدوں کی گارنٹی کافی نہیں ہے، پر تیزی سے سرحد کی بھی گارنٹی ہونا چاہئے اور غالباً سینٹ (Senate) اس خیال میں مجھ سے متفق ہوگی کہ اٹلی معاہدوں کی اس خلاف ورزی کو (جو جرمنی کے قبضہ آسٹریا سے ظاہر ہوگی) کبھی برداشت نہیں کر سکتا، کیونکہ جرمنی کا یہ قبضہ اٹلی کے فتوحات کے اثر کو بالکل ختم کر دے گا اور جرمنی اپنی سلطنت کو وسیع کر کے وسطی یورپ کی سب سے زیادہ طاقتور قوم بن جائے گی۔

لیکن نازی حکومت نے مسولینی کے اس بیان کی کوئی پروا نہیں کی اور نازیوں نے ڈولفس کو قتل کر کے آسٹریا کی آزادی پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ مسولینی بے بلا اٹھا اور اس نے پھر اعلان کیا کہ:-

”آسٹریا کی آزادی ایسا مسئلہ ہے جس کی حمایت ہمیشہ اٹلی کی طرف سے کی جائے گی“

اس کے چند ماہ بعد مسولینی نے دوبارہ اٹلی کی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا کہ:-

”ہم آسٹریا کی آزادی کے لئے جسے چھیننے کے لئے ایک چائسلر کا خون بہایا گیا ہے پوری قوت مدافعت سے کام لیں گے“

لیکن ان اعلانات کی ہٹلر نے بالکل پروا نہیں کی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں اس نے آسٹریا پر بغیر ایک آدمی کا خون بہائے قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد نازی حکومت نے زیکو سلوکیا کو تا کا اور معاہدہ میونخ کی رو سے اس پر بھی ہٹلر کا قبضہ ہو گیا۔ پے در پے جرمنی کی یہ دونوں فتوحات ایسی نہ تھیں کہ اٹلی ان پر صبر کر کے بیٹھ جاتا، لیکن دشواری یہ تھی کہ ایک طرف جیتنے کی جنگ نے اس کو بہت خستہ کر دیا تھا اور دوسری طرف اسپین کے معرکہ میں تقریباً پانچ لاکھ فوج

اس کی مصروف تھی اس لئے وہ خون کا سا گھونٹ بیکر رہ گیا۔

ہٹلر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے یہ اقدامات اٹلی کو پسند نہ آئیں گے لیکن وہ اس سے بھی واقف تھا کہ اٹلی کی عسکری قوت کچھ نہیں ہے اور وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس لئے اس نے مسولینی کی برہمی کی مطلق پرواہ نہیں کی اور بعد کو اس کے قبضہ البانیہ پر رضا مندی ظاہر کر کے ایک حد تک اس کے آنسو بھی پونچھ دئے۔

ان حالات کے تحت جس وقت ہم جنگ کی موجودہ حالت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آمرانہ حکومتوں کا وہ اتحاد جو جرمنی، اٹلی اور جاپان میں قائم کیا تھا ٹوٹ چکا ہے اور ان تینوں کی سامراجی خود غرضیوں نے آپس میں بے اعتمادی پیدا کر کے نازی حکومت کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن شاید ہٹلر اس کو بھی برداشت کر لیتا، اگر روس کی موجودہ مبہم پالیسی نے اس کے لئے اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا نہ کر دیے ہوتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روس اور جرمنی میں باہم یہ طے ہو چکا تھا کہ پولینڈ کو وہ آپس میں تقسیم کر لیں گے مجھے اس کے تسلیم کر لینے میں تامل ہے کیونکہ نازی حکومت اور روسی اشتراکیت میں باہم گہرے اصولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی واقعہ ہے کہ اول اول جب فرانس و برطانیہ نے پولینڈ کے باب میں روس سے گفتگو کی تھی تو وہ نازی حکومت کے خلاف پولینڈ کی مدد کے لئے آمادہ تھا لیکن اس نے شرط یہ لگا دی تھی کہ اسکی فوجوں کو پولینڈ کے اندر داخل ہو کر جرمن افواج کے مقابلہ کی اجازت دی جائے۔ مگر پولینڈ نے اسے منظور نہ کیا اور روس سے کوئی مفاہمت نہ ہو سکی، چنانچہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسٹیمین کے فوجی نامہ نگار نے لکھا کہ ”اگر پولینڈ دوسروں کی مدد حاصل کرنا نہیں چاہتا تو پھر اسے خود اپنی حفاظت کرنا چاہئے“ اور سٹر لائیڈ جارج نے صاف صاف کہہ دیا کہ ”پولینڈ کے تحفظ کی ضمانتیں روس کی شرکت کے بغیر بیکار ہیں اور برطانیہ نے سخت غلطی کی کہ روس کی شرکت بغیر ایسی ضمانت پیش کر دی“

اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ جرمنی نے اسٹالین کو اس بات پر راضی کر لیا ہو کہ وہ پولینڈ کے مسئلہ میں غیر جانبدار رہے گا اور جنگ کھنچ جانے کی صورت میں خام پیداوار اور سامان جنگ سے بھی مدد دے گا، لیکن پولینڈ کی تقسیم پر دونوں کی ساز باز سمجھ میں نہیں آئی، کیونکہ پولینڈ پر جرمنی کے حملہ کا مقصد وہی یہ تھا کہ ایک طرف وہ روک ٹوک پر قبضہ کرے جو غلہ کی پیداوار کے لحاظ سے مشہور زرخیز حصہ ہے اور دوسری طرف رومانیہ میں تیل کے چشموں پر قابض ہو جائے، پھر ایسی صورت میں وہ کیونکر روس سے تقسیم پولینڈ کا بھوکا کر کے اپنی دونوں غرضوں کو خاک میں ملا دیتا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ روس نے جرمنی کے ساتھ سمجھوتا اگر کیا تھا تو درپردہ ایک غرض اس کی یہ بھی تھی کہ نازی حکومت کی پیش قدمی کو حد سے آگے نہ بڑھنے دیا اور اسی لئے جب اس نے دیکھا کہ جرمنی روکرائن کی حدود تک پہنچنے والا ہے تو اس نے سرخ افواج بھی بیکر ایک ”حدادب“ قائم کر دی، جس کی تصدیق روس کے وزیر خارجہ کے بیان سے

بھی ہوتی ہے جس میں صاف صاف ظاہر کیا گیا تھا کہ ”سرخ افواج نے پولینڈ کی سرحد کو اس لئے عبور کیا ہی کہ جرمن افواج جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اس نے مشرقی یورپ میں نئی صورت پیدا کر دی ہے۔“ رائٹر نے بھی اس کا اعتراف کیا تھا کہ ”روس نے آخر وقت تک اپنے ارادہ سے جرمنی کو مطلع نہیں کیا۔“ ڈی بی ٹیلنگٹن نے بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کھلے الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ ”روس کی پیش قدمی ہٹلر کے ساتھ کسی سمجھوتہ کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ روس کا جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہونا قرین قیاس ہے۔“

رہا یہ امر کہ روس کی اس پیش قدمی کو جرمن افواج نے کیوں نہ روکا، سو اس کا سبب ظاہر ہے کیونکہ اول تو روس کے مقابلہ میں جرمن کی کامیابی کا امکان بہت ضعیف تھا اور دوسرے یہ کہ ڈینزنگ اور کورودور کا علاقہ اس کے ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ اگر برطانیہ و فرانس نے اعلان جنگ نہ کر دیا ہوتا اور جرمنی کی مغربی سرحد پر جنگ نہ شروع ہوئی ہوتی تو شاید وہ روسی پیش قدمی کو روکتا، لیکن اس صورت میں تو اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا اور ہٹلر چاہتا تھا کہ جلد از جلد پولینڈ کی طرف سے فارغ ہو کر وہ مغربی سرحد کی حفاظت کی طرف متوجہ ہو۔

ان حالات کے پیش نظر میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ پولینڈ میں روس کا درخور، فی الحقیقت نازی حکومت کے زوال کی ابتداء ہے کیونکہ اب ہٹلر میں نہ یہ ہمت ہے کہ وہ قرب و جوار کی جمہوریت پسند یا کمیونسٹ جماعتوں کو تہ تیغ کر سکے اور نہ رومانیہ اور ہنگری پر قبضہ کا خواب اس کا پورا ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے وسطی یورپ کی ریاستوں کے ساتھ جب روس کا تعلق بڑھے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اشتراکیت سے لوگ متاثر نہ ہوں اور جرمنی کے خلاف جو برہمی زیکو سلوکیا اور آسٹریا وغیرہ کی آبادی میں پائی جاتی ہے وہ یہاں کے لوگوں کو نازی حکومت سے انتقام لینے کے لئے اشتراکی اصول کی طرف مایل نہ کر دے۔

الغرض روس کے قبضہ پولینڈ نے نازی حکومت کے لئے بہت سے خطرات پیدا کر دیئے ہیں اور ہٹلر اچھی طرح محسوس کر رہا ہے کہ استھونیا اور فن لینڈ وغیرہ میں روس کا قدم جما نا صرف اس لئے ہے کہ بحیرہ بالٹک سے جرمنی کے اقتدار کو چھین لے۔

روس کا جرمنی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے جنگ کرنا تو کسی طرح ممکن نہیں، لیکن اگر اسٹالین نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مملکت کو وسیع بنانے کا خیال پیدا بھی کیا تو پھر اس کی جنگ کا رخ کچھ اور ہو گا جس کے متعلق ابھی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن نازی حکومت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور ہٹلر کی پالیسی کو جو شکست ہوئی ہے اس کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہیں۔

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب فلسفہ مذہب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت ۷۰/- رعایتی ۱۲/- علاوہ محصول۔ مینجر ننگار

فردوس ارضی

اگر کوئی پوچھے کہ اس وقت فردوس ارضی کہاں ہے تو آپ بلا تامل روس کا نام لے سکتے ہیں، کیونکہ فردوس کی جو تعریف بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کسے رابا کسے کارے نہ باشد، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جو جگہ فکر و بیماری سے خالی ہے وہی فردوس ہے، اور روس ہی ایک ایسا ملک ہے جس پر یہ تعریف صادق آتی ہے۔

ڈاکٹر جان میکائیل کے ایک ڈاکٹر دوست گزشتہ سال روس گئے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں لکڑی کے اسپتال بنائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ ”یہ اسپتال کتنے دن کام دیں گے، زیادہ سے زیادہ بیس سال؟“۔ جواب ملا کہ ”اس سے زیادہ کی ضرورت بھی کیا ہے“۔ مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کے بعد ہمارے ملک کو اسپتالوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی!۔ یقیناً یہ جواب بہت حیرتناک تھا اور سننے والے کو حیرت ہونا چاہئے تھی، لیکن جب ڈاکٹر صاحب کو وہاں کے حالات کے مطالعہ کا موقع ملا اور انھوں نے لیننگراڈ، ماسکو، خارکو اور کیو وغیرہ پہنچ کر ان تمام انتظامات کو دیکھا جو امراض کے مقابلہ کے لئے روسی حکومت میں جاری ہیں تو ان کو باور کرنا پڑا کہ لوگوں کا جواب غلط نہ تھا۔

فرض کیجئے کہ آپ روس میں بیمار پڑتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں کسی بیمار کو کسی ڈاکٹر کی فیس ادا کرنا نہیں پڑتی اور علاج و تیمار داری کا انتظام وہاں کے محکمہ حفظانِ صحت کے متعلق ہو جو فراہمی آب و روشنی کی طرح آپ کے علاج کا بھی ذمہ دار ہے۔

وہاں کوئی ڈاکٹر پکٹیس نہیں کر سکتا، بلکہ اپنے اپنے گھروں پر وہ مریضوں کو مفت دیکھتے ہیں، اور اگر کوئی شخص اس کے پاس نہیں پہنچ سکتا تو اطلاع ملنے پر خود اس کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ ٹیلی فون سے اطلاع پہنچتی نہیں اور وہ روانہ ہوئے نہیں۔

ڈاکٹر سب سے پہلے آکر یہ دیکھے گا کہ مرض کا سبب کیا ہے اور مریض کے گھر اور اس کے پیشہ کی مصروفیت پر غور کرے گا کہ کہیں مرض کا سبب معیشت و معاشرت سے تو متعلق نہیں ہے اور اس صورت میں وہ مریض کی بہتر معیشت و معاشرت کی سفارش کرے گا جس کا انتظام فوراً حکومت کی طرف سے ہو جائے گا۔

اگر ڈاکٹر دیکھے گا کہ عام شفا خانہ میں علاج نہیں ہو سکتا تو وہ مریض کو کسی مخصوص اسپتال، یا آرام گاہ میں منتقل کر دیگا۔ ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ میں نے ماسکو کے جس اسپتال کا معائنہ کیا وہ عام شفا خانہ تھا جہاں زیادہ تر مزدور، کاریگر اور ان کے خاندانوں کے لوگ آتے تھے۔ ماسکو میں اس طرح کے نو شفا خانے ہیں جو شہر کے مختلف مقامات میں قائم ہیں اور اس لئے ہر شخص آسانی کے ساتھ وہاں پہنچ سکتا ہے۔

ان کی عمارتیں تین منزل کی ہیں اور عمدہ پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر منزل میں بالا خانے بھی ہیں جو ہلالی شکل میں طیارے کے گئے ہیں۔ یہ شفا خانے مختلف شعبے رکھتے ہیں جہاں جراحی، عکس ریز اور بجلی وغیرہ سے علاج کیا جاتا ہے۔ ہر شعبہ میں دس دس ڈاکٹر ہیں جو روزانہ پانچ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ یہ شفا خانے صرف بیرونی مریضوں کے لئے ہیں اور اسی لئے یہاں مریضوں کے ٹھہرنے کا انتظام نہیں ہے۔ ہر مریض باری باری دیکھا جاتا ہے اور چمڑے کی آرام کرسیوں پر انتظار کا وقت کاٹا جاتا ہے اخبارات، کتابیں اور رسائل وغیرہ بھی بہ کثرت رکھی رہتی ہیں تاکہ مریض آسانی سے وقت کاٹ سکیں۔

بالائی منزل پر ایک رسٹوران بھی ہے جہاں ذیابیطس یا دوسرے ایسے امراض کے مریضوں کو جنہیں مخصوص غذا کی ضرورت ہوتی ہے دن میں دو بار مناسب غذا فراہم کی جاتی ہے۔

ایک حصہ اسپتالوں کا بچوں کے لئے مخصوص ہے جس میں متعدد دکرے امراض متعدیہ کی دیکھ بھال کے لئے ہیں۔ یہاں ہر اسپتال میں دو بچوں کے لئے ایک نرسی (دایہ خانہ) بھی ہوتی ہے جہاں ان کا بڑی احتیاط سے علاج ہوتا ہے۔ اسپتالوں سے متعلق یہاں ایک جنگل بھی ہوتا ہے جہاں سال میں دو تین چھینے کے لئے بکے بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سے صحیح و توانا ہو کر واپس آتے ہیں۔

ان اسپتالوں میں ایک عجیب و غریب قاعدہ یہ ہے کہ مہینے میں دو بار تمام عملہ کی میٹنگ ہوتی ہے جس میں نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں گفتگو ہوتی ہے اور انتظام و ترقی کی نئی نئی راہیں سوچی جاتی ہیں۔ اسپتالوں میں بھی یہی طریقہ کار رائج ہے۔

جب ان اسپتالوں میں کسی مریض کا علاج ممکن نہیں ہوتا، تو پھر وہ ان اسپتالوں میں بھیجا جاتا ہے، جہاں اس مرض کا خصوصیت کے ساتھ علاج ہوتا ہے اور مخصوص امراض کے وہاں علیحدہ علیحدہ اسپتال بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اسپتال سرطان کے لئے کھولا گیا تھا جہاں ۸۷ ڈاکٹر کام کرتے ہیں اور اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ مریضوں کا کامیاب علاج یہاں ہو چکا ہے، اس اسپتال میں مخصوص تجربہ گاہیں ہیں، جہاں ہر قسم کی تحقیق و جستجو کا کام ہوتا رہتا ہے۔

یہاں ایک اسپتال صرف ان امراض کا ہے جو مزدوروں اور کاریگروں کو ان کے مخصوص پیشوں اور فرائض کی وجہ سے لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہاں تازہ انسانی خون مریض کے جسم میں منتقل کرنے کا ایک خاص طریقہ رائج ہے جس سے

اور ممالک واقف نہیں ہیں۔

ڈاکٹری کا کورس یہاں پانچ سال کا ہے اور اس کے بعد ایک سال اسپتال میں کام کرنا پڑتا ہے، لیکن نئی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو فیس ادا کرنا نہیں پڑتی بلکہ خود ان کو وظائف دے لئے جاتے ہیں، گویا ڈاکٹری کی تعلیم وہاں ہر اس شخص کے لئے مفت و عام ہے جو داخلہ کے امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ عورتیں بھی بہ کثرت اس تعلیم کو حاصل کرتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ حفظانِ صحت کا معیار وہاں بلند ہوتا جا رہا ہے

ایک عجیب و غریب قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر تیسرے سال کے بعد ایک مہینے کے لئے وہاں تمام ڈاکٹروں کو طبی تعلیم گاہ میں جانا پڑتا ہے تاکہ ان کی طبی تعلیم پھر تازہ ہو جائے۔

نرسوں کی حالت بھی وہاں کچھ مختلف ہے، وہاں اکثر نرسیں شادی شدہ ہوتی ہیں اور سوائے چند پرانی تجربہ کار نرسیں کے سب اسپتال سے باہر اپنے اپنے گھروں یا کلبوں میں رہتی ہیں۔ یہ روزانہ اسپتال آتی ہیں اور سات گھنٹے کام کر کے واپس جاتی ہیں جن کے بچے ہوتے ہیں وہ انھیں گھر چھوڑ آتی ہیں یا ان پبلک تربیت گاہوں میں جہاں حکومت کی طرف سے مفت یہ خدمت انجام دیکاتی ہے۔

وہاں نرسیں دو قسم کی ہیں، ایک معمولی، جن کا کام بستر وغیرہ کا صاف رکھنا اور مریض کو اٹھانا بٹھانا ہے ان کی تعلیم کا زمانہ ایک سال مقرر ہے، دوسری قسم سند یافتہ نرسیں کی ہے، جنہیں چار سال تک تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے اور تعلیم کے تمام مصارف حکومت کے ذمے ہوتے ہیں۔

ایک اور نئی چیز یہاں شہینہ صحت گاہیں ہیں، یہ اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اچھے تو ہو گئے ہیں لیکن اپنے کام پر جانے کے لئے ان کو کچھ دن کھانے پینے اور آرام لینے کی ضرورت ہے۔ ان صحت گاہوں میں بہترین غذا کا بھی انتظام ہوتا ہے اور آرام کے ساتھ رات بسر کرنے کا بھی۔ یہاں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو افکار و محنت کی وجہ سے بڑھ چکے ہیں یا جن کو کمزوری سے وق و سہل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، ان صحت گاہوں میں ہر چیز مفت ہے اور بلا فرق مراتب سب کے لئے ایک ہی سا انتظام ہے۔

زچہ خانے اور تربیت گاہیں یہاں ہر شہر میں بلکہ ہر گاؤں میں ہیں، اور اتنا اچھا انتظام ہے کہ حیرت ہوتی ہے مختلف عمر کے بچوں کے لئے مختلف کمرے ہیں، مختلف قسم کے کھلونے ہیں، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی موٹریں درسیا لکلیں بھی ہیں، جن پر بچے ادھر ادھر اڑتے پھرتے ہیں، علاوہ ان کے ورزش گاہیں بھی ہیں اور تفریح و دلچسپی کے سامان بھی، الغرض روس کی نئی نسل جس انداز سے پرورش پا رہی ہے اس کا مستقبل اتنا شاندار ہے کہ یورپ کے ممالک اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے

جس وقت کوئی بچہ یہاں آتا ہے تو فوراً اس کا ٹیپر کچر دیکھا جاتا ہے اور حلق وغیرہ کا معائنہ ہوتا ہے اور اگر

کسی بچے میں کوئی خرابی پائی جاتی ہے تو فوراً اس کا تدارک کیا جاتا ہے کہ دوسرے بچے اس کی بیماری سے متاثر نہ ہوں۔

دن میں پانچ مرتبہ ہلکی غذا ان کو دی جاتی ہے اور روزانہ گرم پانی سے غسل کرایا جاتا ہے، اور جس ماں کا بچہ چاہے یہاں اپنے بچے کو چھوڑ کر اپنے کام پر جاسکتی ہے۔

اہل روس کی صحت کا معیار وادوسط بہت بڑھ گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں علاج پر کسی کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا اور ہر شخص مطمئن ہے کہ جب تک وہ بیمار رہے گا اس کو براہِ نیشن ملتی رہے گی۔ وہاں کوئی شخص بیکار نہیں ہے اور معاش کی طرف فارغ البالی سب سے بڑی چیز بقائے صحت کے لئے ہے۔ فکر جس چیز کا نام ہے وہ وہاں مفقود ہو گئی ہے اور کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اس فکر میں مبتلا ہو کہ میرے بچے کیا کھائیں گے، کیسے پیسے گے اور کیونکر ان کی تعلیم و تربیت ہوگی کیونکہ ان تمام باتوں کی ذمہ دار حکومت ہے۔

وہاں تو یہ ہے کہ ہر شخص جو کام وہ کر سکتا ہے کئے جائے اور باقی تمام فکریں حکومت کے لئے چھوڑ دے۔ اُن ضعیف عورتوں اور مردوں کے لئے جو کام کے قابل نہیں ہیں نیشن مقرر ہو جاتی ہے اور وہ اپنی بقیہ عمر امن و سکون کے ساتھ بسر کر دیتے ہیں یہ ہیں وہ تمام اہتمامات جن کی بنا پر پیشین گوئی کی جاتی ہو کہ ایک زمانہ آئے گا جب روس سے بیماریاں بالکل دفع ہو جائیں گی اور صحیح معنی میں وہ دنیاوی فردوس بن جائے گا۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی اہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد ہر

مضامین رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریا سے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ہر

میدان عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ہر

بیوہ :- منشی پریم چند آنکھانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمنائے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد ہر

مینجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

محترمی - جو کچھ مجھے عرض کرنا تھا، پہلے عرض کر چکا ہوں۔ پھر آپ کیوں خواہ مخواہ مجھ سے بار بار وہی بات کہلواتے ہیں، جس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے اور مجھے ملال۔ یقیناً میرا فیصلہ سخت ہے لیکن ناگزیر میں زمانہ سے جنگ کرتا ہوں، اس کے رحم پر اپنے آپ کو نہیں چھوڑتا اور آپ کو کیا معلوم کہ کتنا خون دل پینے کے بعد ایک انسان پتھر کا کلیجہ بنا پاتا ہے۔

سالہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود !

میں سمجھا کہ آپ نے اس کو کیوں خودکشی سے تعبیر کیا ہے، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جان دینے اور جان لینے میں زیادہ فرق نہیں ہے، سوال صرف ”دست خویش“ اور ”دست غیر“ کا ہوتا ہے، سو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں میں چند دن سے اپنے احساسات میں ایک خاص تغیر محسوس کر رہا ہوں، آپ بھی سن لیجئے۔ یعنی ہر وہ چیز جسے دنیا زیادہ مکر وہ سمجھتی ہے مجھے اپنی طرف زیادہ کھینچتی ہے اور میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ اخلاقی حقیقتیں شاید بد اخلاقی ہی کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ جن باتوں پر زنیار دتی ہے مجھے ہنسی آتی ہے اور جن باتوں پر سب ہنستے ہیں مجھے رونا آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ”ذہنی رجعت“ ہو، لیکن دیوانہ بننے کے لئے اس منزل سے گزرنا ضرور ہی ہے۔ لیکن آپ تو

ہر چہ بینند وہ عنوان تماشا بینند

اس لئے ہنس لیجئے جتنا ہنس سکتے ہیں، ایک وقت آئے گا کہ آپ ہی کو میرا سر پکڑ کر بیٹھنا پڑے گا۔

حضرت !

شکایت نامہ پہونچا، یہ تو درست نہیں کہ میں ”آئین سجود“ سے ناواقف ہوں، لیکن ”مراتب سجود“ سے

بیشک آگاہ نہیں

میرے یہاں گردن جھکا دینے کے معنی آنکھ بند کر لینے کے بھی ہیں اور آپ کے نزدیک اس میں عقل و ہوش، بصارت و بصیرت، حزم و احتیاط، پیش بینی و مصلحت اندیشی، خدا جانے کس کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں ”رہن محبت“ ہونے کے بعد اپنے تئیں اس سے ”واگداشت“ کرنے کی تدبیر کبھی نہیں کرتا، اور دوسرے پر بھروسہ کر کے تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو بیدار ست دیا سمجھ لینے میں بھی مجھے بڑی راحت حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی مجھے دھوکا دے، لیکن میں کیوں اس کا یقین کر کے وہ کچھ سمجھوں، جس کے سمجھنے سے میری ”لذت عافیت“ برباد ہو جائے

آپ چونکہ ان کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں اس لئے انھیں بدتر سمجھتے ہیں، میں نے ان کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، اس لئے مجھے کیا خبر وہ کیسے ہیں۔ جب میں کسی سے توقع قائم نہ کروں تو پھر بیوفائی کا مجھے کیا اندیشہ۔ آپ کو کیا معلوم کہ امیدوں سے بے نیاز ہو کر جینا کتنی بڑی نعمت ہے!

لاحول ولا قوۃ، آپ نے بھی کس کا ذکر چھیڑ دیا، کہاں کا سکون اور کیسا جذب! اگر میں ان کے ”مبلغ عرفان“ سے واقف نہ ہوتا اور واقعی وہ بڑے پہونچے ہوئے ہوتے تو بھی میرے نزدیک وہ درویشی جو انسان کو دنیا کے لئے بیکار بنا دے لایعنی چیز ہے۔

کسی قلندر سے لوگوں نے پوچھا ”معرفت چیست؟“ اس نے جواب دیا ”نتیجہ بیکاری کہ اگر شغلے دیگر دست بہم میداد، ہیکس دریں خیال نمی افتاد“

گر قابل کسب علی می ز ا دیم
در ورطہ فکر خود نمی افتادیم
دیدیم کہ دست ما بجائے نہ رسید
ار سعی جنوں داد گریباں دادیم

جب کسی کے دامن تک ہاتھ نہ پہونچا تو خود ہی اپنا گریباں پھاڑ ڈالا!
یہ ہے فقر و معرفت کی انتہائی معراج جس پر آپ اتنا سردھنتے ہیں، اگر آپ کے پاس فضول وقت بہت ہے تو آئیے میں آپ کو ”وضع رندی“ کے رموز سے آشنا کروں۔ اگر آپ کو خدا کا جلوہ بادہ و ساغر ہی میں نظر نہ آنے لگے تو میرا ذمہ!

مطاعی الاجل -

کتابوں کی رسید میں آپ نے جن الفاظ سے مجھے یاد کیا ہے، ان کو پڑھ کر واقعی مجھے بڑی شرم آئی، یہ احسان میرا ہے یا آپ کا کہ آپ نے ان کو قبول فرمایا

ہم ادب طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں!

باور کیجئے کہ میرا مقصود بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ مجھے بھلا دیں۔ رہا یہ امر کہ جو طریقہ میں نے اختیار کیا وہ درست تھا یا نہیں، سو شوق و نیاز کی دنیا میں اس کا محاسبہ نہیں ہوتا۔ مقرر کے بازار میں یوسف کی خریداری کے لئے ایک بڑھیا

صرف سوت کی انٹی لیکر گئی تھی۔ اور اگر یوسف کو خبر ہو جاتی، تو شاید اسی کے ہاتھ بک بھی جاتے !
میں بھدا اللہ اچھا ہوں اور اپنے حال پر بالکل قانع۔ پہلے جب ”ہوش و حواس“ کی منطق سے کام لیا کرتا تھا تو
کبھی کبھی دنیا کے کاروبار پر ہنسی آجایا کرتی تھی، لیکن
اب کسی بات پر نہیں آتی
اس سے زیادہ اور کیا چاہئے ؟
زندہ رہئے، خوش رہئے کہ عین یہی میری زندگی و خوشی ہے

یہ آپ نے کیا کیا، کہ بغیر میری تحریر و اطلاع کے امانت اُن کو دیدی۔ یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ وہ میرے ندیم و
رفیق ہیں اور اگر ہوں بھی تو یہ کہاں کا دستور ہے کہ چیز آپ لیں مجھ سے اور حوالہ کر دیں کسی اور کے۔ کم از کم یہ تو سوچا ہوتا کہ
اگر میں اس کی واپسی چاہتا تو تحریر ضرور دیتا
حیرت ہے کہ آپ سا ہوشمند انسان ایسی غلطی کا ارتکاب کرے۔ بہر حال اب ندامت و اشک ریزی سے کچھ نہیں
ہوتا، آپ تو اُن کو بلائیے اور فوراً وہ چیز واپس لیکر اپنے پاس پھر محفوظ رکھ لیجئے۔ اُن سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے
ایسا لکھا ہے، بلکہ آپ تو صرف اصولی بات ان سے کہہ دیجئے کہ جس کی چیز ہے اسی کو براہ راست واپس دیجائے گی۔
میں جواب کا بے چینی کے ساتھ منتظر ہوں۔

جی ہاں، میرے پاس بھی شکایت کا خط آیا تھا، واقعی میں نے ان کے خطوں کا جواب نہیں دیا، لیکن اسکی
ذمہ دار وہ خود ہیں۔ انہوں نے مجھ سے بے تکلفی پیدا کر لی اور عورت کے خط کا جواب کھل کھیلنے کے بعد دینا کوئی معنی
نہیں رکھتا۔

آپ ہی بتائے میں ان کو لکھوں بھی تو کیا، نہ اب اشارت و کنایت میں بات کرنے کا لطف باقی رہا نہ وصل و مجراں
کی حکایت کا۔ پہلے جھوٹ بھی اظہار محبت کرتا تو یقین آجاتا تھا، اب جان دیدوں تو بھی اعتبار نہ آئے۔ سچ ہے
عورت دوستی کے بعد عورت نہیں رہتی اور چونکہ وہ مرد بھی نہیں بنتی، اس لئے وہ ایک مہمل سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے
ہاتھ کی چھٹی اور ٹنگلی، اگر واقعی وہ جزو الانفسک ہو جائے !
آپ تو یہ خط ان کو بھیج دیجئے۔ براہ راست یہی ان کو لکھتا تو شاید اتنا بھی لطف نہ آتا۔

میر صاحب قبلہ،

اگر آپ میرا مشورہ چاہتے ہیں تو آپ کی بزرگی کا پورا احترام کرتے ہوئے بھی مجھے یہی کہنا پڑیگا کہ آپ سخت غلطی میں مبتلا ہیں

یقیناً ”علم شے“ جہل شے سے بہتر ہے، لیکن جب کوئی ”شے“ ہو بھی بہ محض وہم و گمان کو حقیقت جان کر دعوائے ”انا الحق“ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

آپ جس گلستاں سے لیاغ چاہتے ہیں وہ سوائے داغ کے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا۔ خلد میں سر ٹکرانے سے بہتر یہ ہے کہ گھر کے در و دیوار سے قسمت آزمائی کیجئے۔ اس سے اور کچھ نہ ہوگا تو کم از کم ”خون فریاد بر سر فریاد“ تو رہے گا، ورنہ یونہی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلنا کہ شرابانوں میں خون منجمد ہو کر رہ جائے اور آپ انسان سے اچھے خاصے پتھر بن کر رہ جائیں اس کو چہ میں آپ سے پہلے بھی بہت سے لوگ خراب و خستہ ہو چکے ہیں اور آخر کار جب پردہ ہٹا تو معلوم ہوا کہ ہر چہ می دیدم غبار کاروان شوق بود

پھر آپ انھیں کے حال سے عبرت حاصل کیجئے اور اگر یہ واقعی کوئی شاہراہ معرفت ہو تو بھی میں یہی عرض کروں گا کہ بگزر ز علم و شیوہ جہل اختیار کن !

قبلہ مستمنداں،

نوازش نامہ کا جواب غیر معمولی تاخیر کے ساتھ جا رہا ہے، معذرت خواہ ہوں، میں یہاں موجود نہ تھا، کل شام کو آیا اور آج صبح اول اول آپ ہی سے خطاب کی عزت حاصل کر رہا ہوں آپ کی فکر مندیاں بالکل بجا و درست ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کبھی کیا سکتے ہیں۔ ناکامی اس قدر تکلیف دہ نہیں اگر تدبیر کی راہیں کھلی ہوں، لیکن جب یہ بھی بند ہوں تو پھر مرغ پر بستہ کی طرح سوائے تڑپنے اور لوٹنے کے چارہ ہی کیا ہے فی الحقیقت یہ وہ ایذا ہے کہ سوائے خدا کے کسی اور کی سمجھ میں آ ہی نہ سکتی تھی اور انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق اس کی متحمل بھی نہ ہو سکتی تھی !

آپ کہتے ہوں گے کہ میں تو اس لئے خط لکھا تھا کہ کوئی تسکین کا جواب آئے گا لیکن اس نے تو مایوسی میں اور اضافہ کر دیا۔ بالکل صحیح ہے، لیکن میں ابوقت کوئی جھوٹی توقع دلا کر آخر میں آپ کی ناکامیوں کو زیادہ تلخ و ناگوار بنانا پسند نہیں کرتا، کیوں نہ ہیں ابھی سے آپ کو اس وقت کے مقابلہ کے لئے طیار کر رکھوں جس کا آنا ناگزیر ہے۔

آپ چونکہ قدرت کی طرف سے بہت زیادہ درد مند دل لیکر آئے ہیں، اس لئے آپ پر اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چند دن کے لئے آپ کہیں اور چلے جائیں۔ میں یہ مشورہ تو دے رہا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ ممکن نہیں۔ بہر حال اب تو مصیبت کا مقابلہ کرنا ہے، اور جب چارہ کار کوئی نہیں تو کیوں نہ مردانہ وارہ مقابلہ کیا جائے، میں تو خیر نہ سنی ہوں نہ شیعہ، لیکن آپ جس مسلک کے پیرو ہیں، وہ تو یہی بتاتا ہو کہ۔

روئے کشادہ باید و پیشانی فرخ

آنجا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

حیرت ہے کہ حسین کی شہادت پر لوگ روتے ہیں، حالانکہ انہیں جوش میں آنا چاہئے۔ دیکھئے تعبیرات کا ادنیٰ تھا
فرق قوم کی قوم کو کہاں سے کہاں لیجاتا ہے
میں دو چار دن میں حاضر ہوں گا اور خود دیکھ کر اسے قائم کروں گا کہ مریض کس دور سے گزر رہا ہے۔

بندہ نواز، آپ کس کس بات پر سر دھنیں گے۔ خدا کی طرح انسانی حماقت بھی بالکل انہی وابدی چیز ہے
جس کا نہ اور نہ چھوڑا!

پرانے زمانہ میں اس کی حماقتیں بھی پرانی قسم کی تھیں اور اب ترقی یافتہ دور میں وہ بھی بہت ترقی یافتہ ہو گئی ہیں
پہلے صرف ایک مذہب تھا اور اب قومیت، وطنیت، سیاست، مدنیت، صنعت و تجارت وغیرہ خدا جانے کتنی
گنجائشیں ادھنکل آئی ہیں، کہاں تک کوئی بچے گا!

میں نے یہاں کے بعض اکابر سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے طیار ہی نہیں۔
جھگڑا نہ خدا رسول کا ہے نہ بوکر و علی کا، بلکہ صرف اس بات کا کہ دیکھیں کون زیادہ احمق و بدتمیز ثابت ہوتا ہے
پھر آپ ہی بتائیے کہ اس صورت میں منہاجت کا کیا امکان ہے

حضرات شیعہ کا یہ مطالبہ بھی آپ نے سنا کہ وہ اپنی نمایندگی سنیوں سے علیحدہ چاہتے ہیں!
اُس طنز سوادِ اعظم کی حماقت، مسلم لیگ! اور ادھر شیعہ اقلیت کی حماقت، جداگانہ شیعہ نیابت!۔
چلئے بھگڑا ختم ہوا!

قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان میں اس قوم کو اب فنا ہو جانا ہے، لیکن جتنا کہتے ہیں کہ جب تک یہاں
انگریز موجود ہے وہ برابر جئے بانیں گے، خیال کیجئے کہ اس نئے زمانہ میں، زندگی کا مفہوم کتنا بدل گیا ہے!
تف ہے ایسی زندگی!۔

بزمِ شست فلاطوں ز شرم آب نہ شد
بہرِ ترم کہ فلاطوں شد و شراب نہ شد

اگر نومبر کا پرچہ آپ کو نہیں پہونچا

تو برنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجئے، دسمبر ختم ہونے کے بعد آٹھ آنے کے ٹکٹ وصول
ہونے پر بھیجا جاسکتا ہے۔
منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب غنیہ فخر علی صاحب - نگینہ)

مومن کے شکل اشعار حل کرنے کا جو سلسلہ نگار میں قائم ہے، اس سے میں بھی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور ذیل کے اشعار کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں:-

- ۱- دلبروں میں بیوقوف میری وفا کی دھوم ہے
- ۲- غیر کا اور آپ کا اگر دل نہیں ہے ایک تو
- ۳- محشر میں پاس کیوں دم فریاد آگیا
- ۴- ناکامیوں میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی
- ۵- دل کو تعلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی
- ۶- گر بہائے خونِ عاشق ہے وضال
- ۷- یہ عذرا امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
- ۸- ہمارے خونہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو
- ۹- روزِ جزا جو تاتل دلوں خطاب کرتا
- ۱۰- پھر نے سے شامِ وعدہ تھکے یہ کہ سور ہے
- ۱۱- کیا کیا شکن دے ہیں دلِ زار کو گر
- ۱۲- عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں، گو اسی پہ ہوں
- ۱۳- وہ چشمِ انتظار کہاں باز بعد مرگ
- ۱- بواہوس سے کیوں کہا تھا، از جو افشا گیا
- ۲- کیوں ترے دل میں مرے یاد آنے کا چرچا کیا
- ۳- رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا
- ۴- شیریں کو دردِ تلخی فریاد آگیا
- ۵- اب آسماں کو شیوہ بیداد آگیا
- ۶- انتقامِ زحمتِ جلاد کیا
- ۷- میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
- ۸- یہ بعد انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا
- ۹- میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
- ۱۰- آرامِ شکوہ ستمِ اضطراب تھا
- ۱۱- اس کے خیال میں ورقِ انتخاب تھا
- ۱۲- شبِ حالِ غیرِ مجھ سے زیادہ خراب تھا
- ۱۳- دیکھا تو ہم نے آنکھ نہ لگنا بھی خواب تھا

- ۱۴۔ دیکھا نہ ہے یہ رشک و حسد وہ بلا کہ آج، سنبل کو تیری زلف کا سا پیچ و تاب بھتا
 ۱۵۔ کیا جی لگا ہے تذکرہ یاہ میں عبث، ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب بھتا
 ۱۶۔ خاک اٹھیں گے خاک سے جو یونہی، ترک آرام و خواب نے مارا
 ۱۷۔ نازک اندام سے لگی ہے آنکھ، حسرت فرشتہ خواب نے مارا
 ۱۸۔ ہو کے یوسف جو دل چراتے ہو، کون ہو جائے گا غلام مرا
 ۱۹۔ خود گلا کاٹ مواجبہ میں بسمل نہ ہوا، اُن کو آساں نہ ہوا جو مجھے مشکل نہ ہوا
 ۲۰۔ دلہی کیسی وہ دم دیتے ہیں سوائے دشمن، کیا نہ دیتے مجھے میں آپ ہی سایل نہ ہوا
 ۲۱۔ دیتے تکلیف شب بھر میں کیا اپنے پاس، نقد جاں پیشکش مرگ کے قابل نہ ہوا
 ۲۲۔ کیا گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا، شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا
 اب میں سلسلہ دار اپنے شبہات پیش کرتا ہوں:-

- ۱۔ اگر بواہوس نے راز افشا کر دیا تو دلبروں میں مومن کے وفا کی دھوم کا کیا سبب ہوا۔
 ۲۔ دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا ”دل میں چرچا کیا“ کیا بات ہوئی۔
 ۳۔ دم فریاد محشر میں کون پاس آگیا اور کسما کے؟
 ۴۔ کیا مومن کا اور شیریں و فریاد کا ایک ہی زمانہ تھا جو مومن کی ناکامی کا اثر شیریں کے دل پر ہوا۔
 ۵۔ آسمان کو کیا اس سے تعلق اگر ترک محبت کے بعد بھی تعلق باقی ہے۔
 ۶۔ پہلے مصرعہ کا ربط دوسرے مصرعہ سے بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔
 ۷۔ اس شعر کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوا۔
 ۸۔ انفصال کیا ہوا تھا کہ اب یہ جھگڑا نکل آیا اور خونہا کا دعویٰ غیر سے کیوں کیا گیا۔
 ۹۔ مومن کا کیا سوال تھا اور اُس سے خون کا جواب کیونکر ہو گیا۔
 ۱۰۔ دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا خاص کر ”آرام شکوہ“ کی ترکیب!
 ۱۱۔ ”شکر دینے“ سے کیا مراد ہے اور ”ورق انتخاب“ کسے کہتے ہیں۔
 ۱۲۔ اگر معشوق، غیر پر عاشق ہوا ہے تو اس کا حال کیوں خراب ہو۔
 ۱۳۔ آنکھ دگنا کیونکر خواب ہو سکتا ہے۔
 ۱۴۔ ”دیکھا نہ ہے“ کیا نہیں دیکھا ہے؟ اس کا ربط بعد کے الفاظ سے سمجھ میں نہیں آتا۔
 ۱۵۔ ”تذکرہ یار میں عبث جی لگا“ یعنی تذکرہ یار میں جی نہ لگنا چاہئے تھا! اور پھر ناصح سے اجتناب ہونے کا اس سے کیا تعلق ہو

- ۱۶۔ ”جو وہی خاک اٹھیں گے خاک سے“ اس میں اہمال ہے۔
 ۱۷۔ نازک اندام کی تخصیص کیوں کی گئی۔ محبت میں آنکھ لگنا عام بات ہے۔
 ۱۸۔ یہ شعر بھی سمجھ میں نہیں آیا۔
 ۱۹۔ دوسرا مصرعہ ابجھا ہوا ہے۔
 ۲۰۔ وہ کیا دیتے؟
 ۲۱۔ اپنے پاس شب بھر میں کس کو تکلیف دیتے؟
 ۲۲۔ ادروں پر بھی رحم آجاتا تو کس کو گلہ ہوتا؟

نگار) ترتیب وار اپنے شبہات کا جواب سنئے:-

- ۱۔ معشوق نے بواہوس پر مومن کی محبت کا راز ظاہر کر دیا، اُس نے ادروں سے کہا، یہاں تک کہ دلبروں کو بھی خبر ہو گئی اور سب مومن کی وفا کے قایل ہو گئے۔ یقیناً یہ بات ایسی تھی جو معشوق کو بڑی معلوم ہوئی ہوگی، اس لئے اس سے فائدہ اٹھا کر مومن اپنے محبوب کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ تم کیوں راز کی باتیں اس سے کہہ دیا کرتے ہو۔ اور مقصود یہ ہے کہ شاید اسی تدبیر سے اس کا ربط و ضبط غیر سے کم ہو جائے۔
- ۲۔ ”دل میں چرچا کیا“ آپ نے کہاں سے پیدا کیا۔ تیرے دل میں میری یاد آنے کا چرچا غیر نے کیا اور اسی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر کا اور محبوب کا دل ایک ہے کہ ادھر معشوق کے دل میں مومن کی یاد آئی اور ادھر غیر کو اس کی خبر ہو گئی۔
- ۳۔ پاس کوئی نہیں آیا۔ یہاں پاس بمعنی ”حفاظ“ مستعمل ہوا ہے، یعنی محشر میں وقت فریاد مجھے کیوں اس کا حفاظ آگیا، اس سے پہلے اگر کبھی رحم کیا ہوتا تو بیشک اس کی یاد مانع فریاد ہوتی، لیکن جب ایسا نہیں ہے تو میں کیوں محشر میں فریاد نہ کی۔
- ۴۔ مومن اور شیریں فریاد کا زمانہ ایک تو نہ تھا، لیکن یہاں تو مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر آج شیریں ہوتی تو اسے بھی فریاد پر رحم آجاتا اگر میری ہی سی ناکامیاں فریاد کی بھی ہوتیں، یعنی میری ناکامیاں فریاد سے بھی زیادہ ہیں۔
- ۶۔ جب تک محبت تھی دل کا قلق محبت یا محبوب کی وجہ سے تھا لیکن اب ترک محبت کے بعد جو قلق پیدا ہوا ہے اس کا تعلق محبوب سے تو ہو نہیں سکتا اس لئے سوائے آسمان کے اور کون ہے جس کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔
- ۷۔ مومن کا یہ شعر مشہور ہے اور واقعی سچیدہ ہے، اس میں مومن نے بہت سے محذوفات رکھے ہیں۔ مومن نے

محبوب پر ایفاء وعدہ نہ کرنے کا الزام قائم کیا، تو اس نے جواب دیا کہ میں تو قصداً نہیں آیا تاکہ تمہاری محبت کی کشش کا امتحان لوں، لیکن معلوم ہوا کہ تمہاری محبت سچی نہیں ہے ورنہ ضرور اس کی کشش مجھ کو کھینچ ہلاتی۔ اس پر مومن نے کہا کہ میں تو الزام ان پر رکھنا چاہتا تھا، لیکن ”عذرا امتحان جذب دل“ نے اٹا مجھنی کو قصور وار ثابت کر دیا۔

۸۔ چونکہ محبوب نے غیر کے کہنے سے مومن کو قتل کیا تھا اس لئے اس سے خونبہا طلب کیا۔ مومن کو سخت تکلیف پہونچی کہ اس کے قتل کے بعد بھی غیر سے اتنا لگاؤ محبوب کو باقی ہے۔

۹۔ روز جزا محبوب نے قاتل پر دعوائے خون تو کیا لیکن اُسے ”قاتل دلجو“ کہے خطاب کیا، اور اس حالت میں جبکہ اس نے خود قاتل کو دلجو یا مہربان تسلیم کر لیا تو پھر خونبہا کا دعویٰ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا۔

۱۰۔ ”آرام شکوہ“ کی ترکیب آپ نے کہاں سے پیدا کی۔ آرام کو علیحدہ پرٹھے اور ”شکوہ ستم اضطراب“ کو علیحدہ یعنی تھک جانے کی وجہ سے آرام کو ناحقیقتاً ستم اضطراب کا شکوہ تھا جس نے چین سے بیٹھنے نہ دیا اور تھکا مارا۔

۱۱۔ ”ورق انتخاب“ کتاب کے اس ورق کو کہتے ہیں جس میں کوئی خاص پسندیدہ بات درج ہوتی ہے اور قاعدہ ہو کہ ایسے ورق کو موڑ دیتے ہیں (یا شکن دیدیتے ہیں) تاکہ پھر دوبارہ اُسے آسانی سے ڈھونڈا جاسکے۔

۱۲۔ رات کو غیر کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی اور پر عاشق ہو کر اس کی طرف سے بخیر ہو گئے۔ ”گو اسی پہ ہوں“ کا ٹکڑا مومن کی شوخی ہے، جس میں یہ طنز پوشیدہ ہے کہ اگر آپ اس پر عاشق ہوئے ہیں تو اور زیادہ غضب کی بات ہے۔

۱۳۔ مرنے کے بعد چشم انتظار بند ہو گئی تو معلوم ہوا کہ عالم انتظار کی بیداری، خواب و خیال سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ یعنی اس سے کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو سکتا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آخر کار چشم انتظار بند ہو ہی گئی۔

۱۴۔ پہلے مصرعہ کو یوں پڑھئے :-

دیکھانا ہے یہ رشک و حسد وہ بلا کہ آج

۱۵۔ عبت کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے۔ یعنی ناصح سے مجھ کو آج تلک عبت اجتناب تھا۔

۱۶۔ اس شعر کے پڑھنے میں بھی آپ نے غلطی کی۔ جو لہجہ دوسرے مصرعہ سے متعلق ہے۔

۱۷۔ ”نازک اندام“ کی خصوصیت غالباً اس وجہ سے ہے کہ اس کے پاس نزاکت ہی نے ”فرش خواب“ کی آرزو کو پورا ہونے نہیں دیا۔ غالب کا ایک شعر ہے :-

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

- ۱۸۔ یوسف کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جس شخص پر چوری ثابت ہو جاتی تھی اسے صاحب مال کا غلام بن جانا پڑتا تھا۔ مومن کہتا ہے کہ یوسف ہو کے جو دل چراتے ہو، تو یہ بتاؤ کیا تم میرے غلام ہو جاؤ گے۔ یعنی ایسا کبھی ممکن نہیں۔
- ۱۹۔ دوسرے مصریہ کی نثریوں ہے :- جو ان کو آسان نہ ہوا، وہ میرے لئے مشکل نہ تھا، یعنی جو بات ان کے لئے مشکل تھی میرے لئے آسان نکلی۔
- ۲۰۔ مومن اپنے رقیب سے کہہ رہے ہیں کہ تو جو محبوب کی دلہی پر بھولا ہوا ہے تو یہ تیری غلطی ہے کیونکہ وہ تو تجھے دم دیتے ہیں۔ میں بھی اگر چاہتا تو وہ میری دلہی بھی کرتے لیکن میں چونکہ حقیقت سے واقف ہوں اس لئے میں نے اس کا سوال ہی نہیں کیا۔
- مومن کا اصل مقصود، غیر کو محبوب کی طرف سے مایوس کرنا ہے، جسے وہ اس ترکیب سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔
- ۲۱۔ اس شعر میں اپنے پاس کا تعلق دوسرے مصریہ سے ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اگر شب بھر میں ہم کو موت نہ آئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارا نقد جاں اس قابل ہی نہ تھا کہ موت کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اگر کوئی تحفہ موت کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس ہوتا تو ہم ضرور اس کو تکلیف دیتے۔
- ۲۲۔ کیا گلے ہوتے، سوال نہیں ہے، بلکہ ”کیا کیا گلے شکوے ہوتے“ کے مفہوم میں ہے، یعنی شکر ہے کہ تیرا دل میری طرح نرم نہیں ورنہ تو اوروں پر بھی رحم کرتا اور پھر بڑے بڑے شکوے میری طرف سے ہوتے۔

نگار کے پرانے پرچے

- نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-
- (۱۲۶ء) جنوری ۵ء - (۱۲۷ء) مئی ۴ء - (۱۲۸ء) جولائی تا دسمبر ۴ء فی پرچہ -
- (۱۲۳ء) جنوری ۱۲ء - فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ء فی پرچہ - (۱۲۳ء) فروری و جولائی ۴ء فی پرچہ - اکتوبر ۵ء - (۱۲۶ء) جنوری ۵ء - فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ء فی پرچہ -
- (۱۲۷ء) جنوری ۵ء - مارچ تا اگست ۶ء فی پرچہ - (۱۲۷ء) پورا فائل ۷ء
- مینجر نگار - لکھنؤ

کیا آپ کو معلوم ہے؟

متحرک تصاویر پر کتنی دولت صرف ہوتی ہے؟

دنیا کے تمام عکاس خانوں میں ہر منٹ تقریباً ۲۲۶،۰۰۰ آدمی جاتے ہیں اور صنعت فلم سازی پر اس وقت ساری دنیا میں ۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ سرمایہ لگا ہوا ہے جس میں ۴۰ کروڑ پونڈ صرف امریکہ کا ہے اس صنعت میں ۲۸۳،۰۰۰ آدمی کام سے لگے ہوئے ہیں۔ ۲۸۵۰۰ طیارے فلم میں، ۱۳۵۰۰ اشاعت میں اور ۲۴۱۰۰ دکھانے میں۔

ہر سال تقریباً ۵۸۵ تصاویریں طیارہ ہوتی ہیں جن کی لاگت ۳۵۰،۰۰۰ پونڈ ہوتی ہے۔ ان میں ۶۶۵ اداکار کام کرتے ہیں، ۱۷ ڈائریکٹر ہیں اور ۳۵ لکھنے والے۔ علاوہ ان کے روزانہ ۹۶۳ آدمی زائد رکھے جاتے ہیں

صرف ایک فلم کی طیارے کے سلسلہ میں ۲۷۶ دوسری صنعتوں کو مدد پہنچتی ہے

دنیا میں اس وقت عکاس خانوں کی تعداد ۹۰۳۳۴ ہے جن میں ۸۱۸۲ صرف امریکہ میں ہیں۔ یورپ میں ان کی تعداد ۵۹۱۸۷ ہے اور اس کی تقسیم اس طرح :- روس = ۲۶۰۰۰ — جرمنی = ۶۱۴۷ — برطانیہ = ۵۰۰۰ —

اطالیہ = ۴۹۰۰ — فرانس = ۴۵۰۰ — اسپین = ۳۵۰۰ — امریکہ میں یہ تقسیم اس طرح ہے :- برازیل = ۱۲۴۶ — میگزیکو = ۱۱۱۵ — ارجنٹائن = ۱۰۲۱ — جاپان میں ان کی تعداد ۱۷۱۷ ہے، آسٹریلیا

میں ۱۵۴۱، اور ۵۸۳۴ میں ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک شامل ہیں۔

گزشتہ جنگ میں کتنا نقصان ہوا؟

۸۵ لاکھ سے زیادہ آدمی جان سے مارے گئے، ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ زخمی ہو کر بیکار ہو گئے، اور ۸۰ ارب پونڈ کا مالی نقصان ہوا۔ اور یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ ہم اس سے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، انگلستان، ویس، آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ، فرانس، بلجیم، جرمن اور روس کے ہر خاندان کے لئے ایک ایک گھرا یا طیارہ کر سکتے تھے جس پر (فی گھر) ۵۰۰ پونڈ لاگت آتی،

جس میں ۲۰۰ پونڈ کا فرنیچر ہوتا اور جس کے ساتھ ۱۰۰ پونڈ قیمت کی ۵ ایکڑ زمین شامل ہوتی، اور اس کے بعد بھی اتنی رقم بچ جاتی کہ ان ملکوں کے ہر اس شہر میں جس کی آبادی ۲۰ ہزار یا اس سے زیادہ ہے ایک ایک لائبریری ۱۰ لاکھ پونڈ کی لاگت سے اور ایک ایک یونیورسٹی ۲۰ لاکھ پونڈ کے صرف سے قلم ہو سکتی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی اتنا بچ رہتا کہ اگر ہم چاہتے تو فرانز و لچیم کے تمام کارخانے، کلیسا، ریلوے، بلکہ وہاں کا ایک ایک گھر خرید سکتے!

زمین کی عمر کتنی ہے؟

ایک ہیئت داں زمین کی عمر کا اندازہ اس وقت سے کرتا ہے جب اس میں انجماد شروع ہوا، طبقات الارض کا ماہر اس وقت سے ابتدا کرتا ہے جب اس میں سب سے پہلی پتھر ملی تہ پیدا ہوئی۔ چنانچہ بعض ہیئت داں کہتے ہیں کہ دو ارب سال گزرے جب اس میں انجماد شروع ہوا تھا اور طبقات الارض کے ماہرین کہتے ہیں کہ ۲۵ کروڑ سال ہوئے جب سب سے پہلے اس میں پتھر ملی تہ پیدا ہونا شروع ہوئی۔

زمین کی عمر معلوم کرنے کی ایک صورت یہ بھی اختیار کی گئی کہ سمندروں میں نمک کی جتنی مقدار پائی جاتی ہے اس سے یہ اندازہ کیا گیا کہ اتنا نمک کتنے زمانہ میں حاصل ہوا ہوگا اور اس طریقہ سے بھی تقریباً وہی مدت نکلی جو طبقات الارض والوں نے متعین کی ہے۔

ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ چٹانوں کی سب سے پہلی تہوں میں ان دھاتوں کا پتہ چلایا جائے جو دوسری دھاتوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، یورانیئم (Uranium) وہ اصل دھات ہے جو بعد کو بہت سے تغیرات کے بعد کیسے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس لئے جب چٹانوں میں ان دونوں دھاتوں کا اندازہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان کے کیمیاوی تغیرات میں کتنا زمانہ صرف ہوا ہوگا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح ۶۰ کروڑ سال کا زمانہ زمین پر گزر چکا ہے۔

زمین کی عمر معلوم کرنے کی ایک صورت اور سوچی گئی، وہ یہ کہ پہاڑوں کی ساخت اور قابل آبادی خشک حصہ زمین پر غور کیا جائے کہ کتنے زمانہ میں انھوں نے یہ ہیئت اختیار کی ہوگی اور اس کی بنا پر ۳۵ سو سال کا زمانہ متعین کیا گیا ہے اور چونکہ یہ طبقات الارض والوں کے پہلے اندازہ سے ملتا جلتا ہے اس لئے عام طور پر اب اسی کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔

ستارے ہم سے کتنی دور ہیں؟

ستاروں کا بعد نظر ہر کرنے کے لئے ایک خاص پیمائش وضع کی گئی ہے جسے ”نوری پیمائش“ کہتے ہیں، یعنی یہ کہ کس ستارے کی روشنی کتنے دنوں میں ہم تک پہنچتی ہے اور چونکہ روشنی کی رفتار ہمیں معلوم ہے اس لئے بعد کا اندازہ آسان ہو جاتا ہے۔

روشنی کی رفتار ۱۸۶۳۰۰ میل فی سکند ہے اور آفتاب کی روشنی ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آفتاب ہم سے ۸ منٹ کے نورانی فاصلہ پر واقع ہے۔ زمین سے قریب تر ستارہ وہ ہے جسے انگریزی میں (*Alpha Centauri*) کہتے ہیں جس کی روشنی ہم تک تقریباً سو اچار سال میں پہنچتی ہے گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ وہ ہم سے ... ۲۵،۲۸۴،۰۰۰ میل دور واقع ہے۔ اور بعید ترین ستارہ (*Betelgeuse*) ہے جس کی روشنی ۲۰۰ سال میں ہم تک پہنچتی ہے اور جس کا بعد ظاہر کرنے کے لئے ریاضی کے پاس کوئی عدد موجود نہیں

اس وقت تک دنیا میں کتنی لڑائیاں لڑی گئیں؟

زمانہ قبل تاریخ کا حال تو معلوم نہیں کہ انسان نے اس وقت کتنی لڑائیاں لڑیں اور کس کس طرح، لیکن زمانہ تاریخ کی لڑائیوں کا اندازہ ۵۰۰ سال قبل مسیح سے ۱۹۲۵ء تک ۹۰۲ کیا گیا ہے۔
بارہویں اور تیرہویں صدی میں سب سے زیادہ لڑائیاں روس نے لڑیں، چودھویں صدی میں انگلستان نے، پندرہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک آسٹریا نے اور انیسویں صدی میں فرانس نے

اسفنج جانور ہے؟

اسفنج جسے اب مردہ بھی کہتے ہیں ایک نرم سی چیز ہے جس کے اندر پانی جذب ہو جاتا ہے اور نہانے دھونے کے کام آتا ہے۔ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ سمندر کے کسی درخت سے حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جانور ہے جو سمندروں اور بعض جھیلوں میں پیدا ہوتا ہے

یہ جانور زیادہ تر گرم سمندروں میں پایا جاتا ہے اور جانور ہی کی طرح اس کی نسل بڑھتی ہے۔ جو اسفنج ہم استعمال کرتے ہیں حقیقتاً یہ اسی جانور کا ڈھانچہ ہے، اسفنج کے اندر جو سوراخ یا کھوکھلا پن نظر آتا ہے اسی کے اندر یہ جانور رہتا ہے اور اوپر سے ایک سخت سی کھال منڈھی رہتی ہے

اس جانور کی عجیب و غریب خصوصیت یہ ہے کہ اگر اسفنج کے ٹکڑے کر دیے جائیں تو ہر ٹکڑا اپنی جگہ ایک مستقل جانور بن جائے گا بلکہ اگر اسفنج کے ریشے ریشے علیحدہ کر دیے جائیں تو بھی یہ جانور فنا نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ کسی زندہ اسفنج کو لیکر نچوڑ لیجئے اور اس کے اندر سے جو سفید دودھ کا مادہ نکلتا ہے اسے کسی برتن میں ڈالکر سمندر کے پانی سے بھر دیجئے، چند دن کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس مادہ نے پھر اسفنج کی صورت

اختیار کر لی ہے

دباؤ سے کیا کیا کام لئے جاسکتے ہیں؟

چمکاگو کے ایک اسلحہ سازی کے کارخانے میں ایک مربع انچ پر ۵ لاکھ پونڈ کا دباؤ ڈال کر مختلف تجربے کئے گئے ہیں اور ان کے نتائج بہت عجیب و غریب ثابت ہوئے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

اگر ایک مربع انچ پر ایک لاکھ ۸۰ ہزار پونڈ کا دباؤ ڈالا جائے تو جراثیم فنا ہو جاتے ہیں۔ گویا اب جراثیم کی ہلاکت کیلئے گرمی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ صرف دباؤ ڈالنے سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

چار لاکھ پونڈ کا دباؤ اگر ایک مربع انچ پر ڈالا جائے تو تیل تانہ کی طرح جل کر رہ جاتا ہے اور ۵ لاکھ پونڈ کے دباؤ سے اس کا حجم آدھا ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر دو دھ پر اسی دباؤ سے کام لیا جائے تو وہ ایک مہینہ تک تازہ رکھا جاسکتا ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب کون ہے؟

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی مطبوعہ کتاب وہ ہے جو گیارہ سو سال قبل چھاپی گئی تھی۔ یہ کتاب سنہ ۱۹ء میں ترکستان کے کسی مکان میں دیوار کے اندر چھپی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ مکان سنہ ۱۰۳۵ء میں تعمیر ہوا تھا اور یہ کتاب ایک صدی اس سے قبل چھاپی گئی تھی۔

چینی مطبوعات میں یہ کتاب سب سے پرانی اور بہت زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے اور برٹش میوزیم میں رکھی ہوئی ہے۔ نویں دسویں صدی کا زمانہ چین کی انتہائی ذہنی ترقی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۹۹۷ء میں ایک چینی لغت طیار کیا گیا جس میں ۲۶۴۳۰ الفاظ یا علامات موجود تھیں۔ اس سے بھی پہلے سنہ ۱۹۷۲ء میں ایک کتاب "اخلاق بودھ" کے موضوع پر چھاپی گئی تھی جو ایک لاکھ ۳۰ ہزار صفحات کو محیط تھی۔

پولینڈ کے گداگروں کا کیا اقتدار ہے

وارسا، پولینڈ کا پایہ تخت تھا جس پر اب جرمنی نے قبضہ کر لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پولینڈ بھر میں وارسا کے گداگر سے بہتر کوئی جگہ گداگروں کے لئے نہیں ہے۔ یہاں سیکڑوں مرد عورت ہر وقت پڑے رہتے ہیں جن کی عمریں گداگری میں بسر ہو گئی ہیں۔ گرجا کے احاطہ میں بعض جگہ ایسی ہیں جو خصوصیت کے ساتھ بڑے نفع کی سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ ایک فقیر نے دوسرے فقیر کو ۴۰۰ معاوضہ دیکر ایسی ہی ایک جگہ حاصل کی۔

گزشتہ سال یہاں کے گداگروں کی ایک کانگریس، وارسا میں منعقد ہوئی تھی جس میں سیکڑوں نمائندوں نے

حصہ لیا تھا۔ اس جلسہ میں انھوں نے گداگروں کے حقوق حکومت کے سامنے پیش کئے اور خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ ہوٹلوں، اسپتالوں اور صحت گاہوں میں گداگروں کے مخصوص حقوق گداگری کو تسلیم کیا جائے پولیٹیز میں ان مقامات پر گداگروں کا بڑا ہجوم رہتا ہے، یہاں تک کہ ہوٹلوں، اسپتالوں اور صحت گاہوں میں مسافروں کے قیام اور مریضوں کے علاج میں بھی سخت دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک بار ہوٹلوں کے مالکوں نے ملکر ایک بڑی رقم گداگروں کے سامنے پیش کی تاکہ آئندہ وہ ہوٹلوں کا طواف ترک کر دیں، لیکن انھوں نے اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ گداگری کی قدیم روایات کی توہین ہے اور ہم اسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے، چنانچہ انھوں نے اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا اور ہوٹل والوں کو مجبوراً اسپر ڈال دینا پڑی۔

بم باری کے وقت کیا احتیاط کرنی چاہئے؟

عام لوگوں کا خیال ہے کہ ہوائی جہاز سے جب بم گرائے جاتے ہیں تو وہ سیدھے زمین کی طرف آتے ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، بم ہمیشہ ترچھے آتے ہیں اور ان کے نقصانات بھی ترچھے زاویہ سے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کبھی کھلے میدان میں بم گرنے کا اندیشہ پیدا ہو تو فوراً زمین پر لیٹ کر کوئی چیز دانتوں سے مضبوط پکڑ لینی چاہئے۔ کھلی ہوئی فضا میں اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں، لیکن اگر اتفاق سے کوئی مکان کے اندر موجود ہے اور بم گرائے جا رہے ہیں تو دو کھلی ہوئی کھڑکیوں کے درمیان حصہ دیوار کے پاس پناہ لینی چاہئے

اب ہوا باز تک خبریں کیونکر پہنچیں گی؟

امریکہ نے حال ہی میں ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام (Radio teleprinter) ہے یعنی "لاسلی کی خبریں چھاپنے والا"

اس وقت یہ دستور ہے کہ ہوا باز کے کانوں سے ٹیلی فون کا سا ایک آلہ لگا رہتا ہے جس سے اس کو موسمی و فضائی حالات کا علم ہوتا رہتا ہے، لیکن اب اس جدید آلہ کی ایجاد نے یہ زحمت دور کر دی ہے۔

ہوا باز کے سامنے یہ آلہ رکھا رہے گا (جس کا وزن صرف چند پونڈ ہے) اور خود ہی فضائی حالات کے متعلق خبریں چھاپتا رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاز جتنا زیادہ بلند جائے گا یہ آلہ اتنا ہی بہتر کام دے گا

تنوعات

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء تک کی لڑائیوں میں جتنے آدمی ہلاک ہوئے، ان سے دو چاند گزشتہ جنگ عظیم میں مارے گئے۔ جس وقت کلیسا کے رومن کیتھولک کے اسقف اعظم کا انتخاب ہوتا ہے تو اداے مرسم کی ابتدا اس کے منہ بند کر لینے سے ہوتی ہے اور انتہا منہ کھول دینے پر، اُس سے مراد غور تامل ہے اور اس سے آزادانہ رائے۔ کرہ ارض کا ۵۰۲۰۰۰۰ مربع میل رقبہ مردوں سے آباد ہے۔ سب سے بڑی مچھلی جو ہنسی کے ذریعہ سے پکڑی گئی وہ ہے جسے کوویل نامے ایک شخص نے جنوبی آسٹریلیا میں شکار کیا تھا اس کا وزن ۱۲۹۱ پونڈ تھا۔ شمالی افریقہ کی مور آبادی جب ایک دوسرے سے ملتی ہے تو شامہ کو چومتی ہے۔ لٹکا میں بعض نہایت عجیب و غریب قسم کے کیڑے پائے جاتے ہیں، ایک کیڑا ایسا ہے جسے ”جاندار پتی“ کہتے ہیں، اس کا جسم بالکل پتی کی طرح ہوتا ہے اور پتی ہی کی طرح اس میں بہت سی رگیں ہوتی ہیں اور جس وقت کوئی خطرہ ہوتا ہے تو پتی ہی کی مانند اس میں جنبش پیدا ہوتی ہے۔ اٹلی میں جب لوگ قبرستان میں جاتے ہیں تو اپنے اعزہ و احباب کی قبروں پر ملاقاتی کارڈ بھی چھوڑ آتے ہیں۔ دریائے رھون جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اندر سے گزرتا ہے دنیا کا نہایت تیز رفتار دریا تسلیم کیا جاتا ہے، کیونکہ بعض مقامات پر اس کے بہاؤ کی رفتار ۴۰ میل فی گھنٹہ سے کم نہیں ہے۔ برطانیہ کی آبادی میں سترہویں آدمی کے پاس موٹر پائی جاتی ہے۔ آفتاب سب سے زیادہ روشن اور سب سے زیادہ بڑا سیارہ معلوم ہوتا ہے لیکن بغیر دوربین کی مدد کے ہم کو جتنے مستقل سیارے دن کو نظر آتے ہیں ان میں سب سے چھوٹا یہی ہے۔ تمام وہ جانور جو ہرن کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے پتہ نہیں ہوتا۔ ایک انچے پارشس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک ایکڑ زمین پر سوٹن سے زیادہ پانی برسا۔ برطانیہ کے سرکاری دفاتر میں سالانہ دس ہزار ٹن کا غنڈر دی کی ٹوکریوں سے نکلتا ہے۔

قاہرہ کا ایک لطیفہ

قاہرہ میں ایک منارہ بنا ہوا ہے جس پر ایک چھوٹی سی توپ رکھی ہوئی ہے جو ٹھیک دوپہر کے وقت داغی جاتی ہے۔

ایک ڈچ جہاز جب یہاں پہنچا تو اس کے افسر کو یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی کیونکہ اس طرح ساری آبادی کو وقت کا پتہ چل جاتا تھا اور لوگ اپنی اپنی گھڑی ملا لیتے تھے۔ یہ منارہ کے محافظ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا:-

”تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوتا ہے کہ اب ٹھیک بارہ بجے ہیں؟“ محافظ نے جیب سے ایک گھڑی نکالی اور بولا:- ”اس گھڑی کی مدد سے مجھے وقت کا پتہ چلتا ہے جو یہاں کے بہترین گھڑی ساز کی بنائی ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً وہی اس کو درست کرتا رہتا ہے۔“

یہ افسر گھڑی ساز کے پاس گیا اور پوچھا: ”تمہیں کیونکر پتہ چلتا ہے کہ اب ٹھیک بارہ بجے ہیں؟“ اس نے ہنس کر جواب دیا: ”یہ کونسی مشکل بات ہے، جب توپ داغی جاتی ہے تو میں اپنی گھڑیوں کو اسی سے ملا لیتا ہوں۔“

جنگ عظیم کے بعد سے اس توپ کا داغا جانا بند ہو گیا ہے۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر — قیمت مع محصول ۱۲/۱۱
مینجر نگار — لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

بہاراں | مجموعہ ہے خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی غزلوں کا جو نہایت خوبصورت طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل آپ کا پہلا دیوان اثرستان کے نام سے شائع ہو کر اہل نقد و نظر سے کافی داد حاصل کر چکا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مجموعہ جو یقیناً جناب اثر کے ارتقائی دور تغزل کی پیداوار ہے اور زیادہ خوبیوں کا حامل نہ ہو

اس مجموعہ بہاراں میں (جس کا نام اثرستان کے لحاظ سے بہارستان ہونا چاہئے تھا) ۳۵۰ صفحات اس کلام کے لئے وقف ہیں جو اشاعت اثرستان کے بعد کہا گیا ہے اور ۳۱۰ صفحات انتخاب "اثرستان" کے لئے ترتیب کی اس نوعیت سے ایک ذہنی فائدہ تو یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دونوں زمانوں کے رنگ تغزل میں امتیاز کرنا آسان ہو جائے گا اور دوسرا اقتصادی فائدہ یہ کہ "بہاراں" کا خریدار "اثرستان" کے حاصل کرنے پر مجبور ہوگا جناب اثر کی شاعری کی صحیح عمر مجھے معلوم نہیں، لیکن قیاس کہتا ہے کہ تیس سال سے کم نہ ہوگی اور اتنی دیرینہ مشق کے بعد جو خوبیاں ایک فطری خوش ذوق شاعر کے کلام میں پیدا ہونا چاہئے۔ اُن سے کہیں زیادہ ہمیں کلام اثر میں نظر آتی ہیں۔

آجکل عام طور پر یہ دستور ہو گیا ہے کہ جب کسی شاعر کے کلام پر نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے تو اس سے بھی ضرور بحث کی جاتی ہے کہ اس کا پیغام کیا ہے، یہ بالکل جدید اصطلاح ہے جو مغربی لٹریچر سے لی گئی ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ شاعر کا "مقصد حقیقی" معلوم کیا جائے، لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے جب غزلگو شعراء کے کلام پر بھی یہی عمل جراحی کیا جاتا ہے۔

ایک غزل گو شاعر، خیال کی اتنی وسیع دنیا اپنے ساتھ رکھتا ہے کہ ہم اس سے نہ تحدید مکان و زمان کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور نہ تعین مقصد و اصول کا۔ وہ "لانہایت" کی پیداوار ہے، اس لئے اس کے جذبات کی بھی کوئی حدود انتہا نہیں ہوتی، وہ قدرت کا تاشائی ہے اس لئے اس کے نتائج مطالعہ میں یکسانیت کی جستجو بے معنی ہے البتہ اظہار تاثر میں ضرور تنوع ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ہم کو ایک غزل گو شاعر کا مرتبہ متعین کرنے میں سود دیتی ہو

جناب اثر کے اس مجموعہ کو جب ہم اس نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں "قدراول" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے کلام کی یہ خصوصیت کہ اس میں کوئی چیز "پست و رکیک" نظر نہیں آتی انتقاد کے مثبت پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کا نہایت محبوب مشغلہ ہے اور جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ کسی خاص تاثر کا نتیجہ ہوتا ہے۔
یونہی ان کے کلام میں میر، مومن، غالب، مینوں کا رنگ ملتا ہے، لیکن خود ان کا موجودہ میلان زیادہ تر میر کی طرف ہے، جو یقیناً غزل گوئی کی معراج ہے۔ چونکہ اس مجموعہ پر ایک بسیط انتقادی مضمون پیش نظر ہے، اس لئے اقتباس کلام نہیں دیا جاتا۔

اس مجموعہ کی قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ نظامی پرس لکھنؤ

معارف جمیل | جناب حکیم آزاد انصاری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتداء میں جناب آزاد نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے حالات زندگی لکھے ہیں جن میں سے بعض نکات شاعری سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

آزاد انصاری، ہندوستان کے مشہور خوشگو شعراء میں ہیں اور اپنے انداز بیان کے لحاظ سے بعض ایسی خصوصیات بھی رکھتے ہیں جو انھوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اجراء نگار کے ابتدائی زمانہ میں ایک بسیط مضمون ان کی شاعری پر نکل چکا ہے اور ان کے ذوق کی میں بار بار داد دیکھا ہوں۔

یہ مجموعہ مجلد شایع ہوا ہے اور عجمیوں کا شانہ باز۔ گھانسی بازار حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔

کائنات دل | یہ مجموعہ ہے جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے منظومات کا جو نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے۔ اس میں قومی، اخلاقی، سیاسی اور محاکاتی سبھی قسم کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ اچھی ہیں۔ انداز بیان سلیس ہے اور الفاظ کی جستجو کامیاب و ہر محل۔

جناب منور مذہباً ہندو ہیں، لیکن اپنے مشرب کے لحاظ سے بالکل آزاد۔ اردو زبان پر ان کو اتنا ہی عبور حاصل ہے جتنا لکھنؤ کے کسی مسلمان شاعر کو ہو سکتا ہے اور ان سب باتوں نے ملکر ان کی نظموں میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ یہ صرف نظموں کا مجموعہ ہے، غزلوں کا کلیات اس کے بعد شایع ہوگا۔ اس کی قیمت پچاس روپے ہے اور ملنے کا پتہ رگھویر پرشاد سکینا، بلیلی خانہ، دہلی۔

آب حیات کے لطیفے | مولانا آزاد نے اپنی مشہور کتاب "آب حیات" میں شعراء کے بہت سے لطائف و ظرایف بھی بیان کئے ہیں۔ اب انھیں کو آغا محمد اشرف ام۔ اے نے ایک جگہ کر کے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ ان لطایف کی تاریخی حیثیت جو کچھ بھی ہو، لیکن تفریحی حیثیت یقیناً

بہت دلچسپ ہے۔ یہ کتاب ہم میں حالی پبلشنگ، ہاؤس کتاب گھر دہلی سے مل سکتی ہے۔

یادِ چکبست

۱۲ فروری ۱۹۷۹ء کو یہاں لکھنؤ میں یومِ چکبست منایا گیا تھا اور اس سلسلہ میں جو مقالات وہاں پڑھے گئے انھیں کا مجموعہ یادِ چکبست کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ پنڈت انند نرائن ملانے جو لکھنؤ کے مشہور خوشگوشاعروں میں سے ہیں، اور کشمیری الاصل ہونے کے لحاظ سے چکبست مرحوم سے خاص تعلقات رکھتے تھے، یومِ چکبست کا اہتمام کیا تھا اور انھیں کی سعی سے یہ مجموعہ مضامین شائع ہوا ہے۔ چکبست موجودہ عہد کے ان شاعروں میں سے تھے، جن کو تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی اور جن کے خدمات اپنے بعد ایک مستقل یادگار چھوڑ گئی ہیں۔ لکھنؤ میں چکبست پہلے وہ شخص تھے جنہوں نے غزلیوں سے ہرست کر نظم نگاری کی طرف توجہ کی اور اس میں وطنی و قومی عنصر شامل کر کے ایک نئی زندگی کے آثار پیدا کئے۔

ضرورت ہے کہ ایسے شعراء کی یاد کبھی کبھی ہوتی رہے اور قابلِ ستائش ہیں وہ لوگ جو اس یاد کے قائم رکھنے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ملک کو پنڈت انند نرائن صاحب ملا کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یومِ چکبست کو کامیاب بنا کر ایک نہایت ضروری فریضہ کو تکمیل کے ساتھ انجام دیا۔

جو لوگ چکبست کی شاعری کا مطالعہ مختلف پہلوؤں سے کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ قیمت درج نہیں ہے، جو حضرات اسکو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ انڈین پرس الہ آباد سے خط و کتابت کریں۔

انتخاب ہے محمد تراب علی خاں صاحب باز کی غزلوں کا۔ باز صاحب حیدر آباد کے نوجوان شاعروں میں سے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اس سے قبل بھی ایک انتخاب ان کے کلام کا "باز کے سو شعر" کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اب یہ انتخاب کئی سو اشعار کا شائع کیا گیا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت ۳ روپے اور ملنے کا پتہ: کاشانہ باز، بازار گھانسی میاں، حیدر آباد دکن۔

ایک کہانی چھ بیویوں کی زبانی | لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ایک مسلسل فسانہ چھ قسطوں میں نشر کیا گیا تھا جسے چھ افسانہ نگاروں نے پورا کیا تھا، اس کو اب کتب خانہ علم و ادب دہلی نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ جن چھ افسانہ نگاروں نے اس کو پورا کیا ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں: نیاز فتحپوری - علی عباس حسینی - ل - احمد - سجاد حیدر یلدرم - امتیاز علی تاج - حکیم احمد شجاع - قیمت ۶ روپے اور ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

رحمۃ اللعالمین | سیرۃ رسول اللہ پر جتنی کتابیں اس وقت تک لکھی گئی ہیں، ان میں قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی اس کتاب کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اس کے مولف نے فراہمی مواد میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور دورانِ عقل باتوں سے بڑی حد تک اس کو پاک رکھا ہے۔

پہلی جلد

نائل مولف نے غیر اسلامی لٹریچر سے بھی مواد فراہم کر کے اسے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، عبارت سلیس، طرز تحریر شگفتہ اور طریق استدلال بہت پاکیزہ ہے۔

اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی

نامورانِ اسلام | اس کتاب میں عرب و عجم کے ساتھ مشاہیر کے مختصر لیکن معتبر حالات درج ہیں حضرت محمد حسین حسان (جامعی) نے نہایت سہل و شگفتہ پیرایہ میں تمام حالات قلمبند کئے ہیں اور اس لئے ہر عمر کے انسان کے لئے ان کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ قیمت ۲ روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مغلوں کا مد و جزر | خواجہ محمد شفیع صاحب نے تمثیلی و محاکاتی انداز میں مغلوں کے عروج و زوال کی تصویر کھینچی ہے اور نہایت پاکیزہ انداز میں۔ آفرینش عالم سے آغاز کیا گیا ہے اور رفتہ رفتہ اس کتاب کا انداز تحریر بالکل وہی ہے جو بزار ڈش نے "Adventure of a black girl" میں اختیار کیا ہے۔ قیمت ۲ روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

کایا پیٹ | ایک مختصر سا ڈرامہ ہے محمد عبدالغفار صاحب مدہولی کا جو جامعہ ملیہ میں مدرسہ ابتدائی کے مدرس ہیں، اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک کابل طالب علم کس تدبیر سے مستعد بنایا گیا۔ قیمت ۲ روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

دو بھائی | ایک دلچسپ کہانی ہے جو سید حسن صاحب ام۔ اے نے بچوں کے لئے لکھی ہے۔ زبان صاف، انداز تحریر شگفتہ اور پلاٹ دلچسپ ہے۔ قیمت ۴ روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ | اس سلسلہ کی یہ دوسری جلد ہے جس میں مارشل جیاگ کانی شک اور رضا شاہ پہلوی کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس سے قبل پہلی جلد پر نگار میں ریویو ہو چکا ہے۔ دائرہ ادب نے یہ سلسلہ نہایت مفید شروع کیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ لوگ اس کی قدر کریں گے۔ اس حصہ کی قیمت ۸ روپیہ ہے۔

افسانہ پدمنی | سلطان علاؤ الدین خلجی اور چتوڑ کی رانی پدمنی کی داستان عشق اس قدر مشہور ہے کہ اب ہر شخص اسے واقعہ تاریخی سمجھنے لگا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جس وقت میں تاریخ ہند لکھ رہا تھا اس وقت میرے سامنے بھی یہ مسئلہ آیا تھا اور ارادہ تھا کہ اس پر بسیط گفتگو کی جائے لیکن موقع نہ ملا، البتہ مختصر آئینے ظاہر کر دیا تھا کہ۔

"عبداللہ کے خاص واقعات میں ایک واقعہ خضر خاں اور دیول رانی کی محبت کا ہے لیکن تاریخ فیروز شاہی میں جو اس عہد کی نہایت مستند تاریخ ہے اس واقعہ کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح خود علاؤ الدین خلجی کا راجہ چتوڑ گڑھ کی رانی پدمنی کے حسن و جمال کا شہرہ منکر اس پر عاشق ہونا اور پدمنی کا آگ میں جل کر جان دینا بھی ضیا بمرنی نے کہیں تحریر نہیں کیا، حالانکہ

وہ سخت مقصد مزاج مورخ تھا اور اس نے تمام وہ باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر درج کی ہیں جن سے علاؤ الدین پر کوئی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۸۸ تاریخ اسلامی ہند)

اس لئے مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ جناب محمد احتشام الدین دہلوی ام۔ اے نے پوری مورخانہ کاوش کے ساتھ اس کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کر دیا۔ یہ کتاب ۸ میں کتب خانہ علم و ادب دہلی سے مل سکتی ہے۔

برگسبزر مسئلہ میراث پر خواجہ احمد الدین مرحوم کا رسالہ ہے جس میں انھوں نے معقول و منقول سے کام لیکر پوری داد تحقیق دی ہے۔ میراث کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں، اس لئے اس باب میں موافق و مخالف جو کچھ لکھا جائے اس کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔ دو آنے میں دفتر امت مسلمہ امرتسر سے یہ رسالہ مل سکتا ہے۔

ابوالخمر ترجمہ ہے ٹالسٹائی کی ایک مشہور اخلاقی تمثیل کا جسے جناب مجنوں گورکھپوری نے پیش کیا ہے۔ عرصہ ہوا یہ ڈرامہ نگار میں شائع ہوا تھا۔ اب کتابی صورت میں انوار بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ ٹالسٹائی کا ڈرامہ اور مجنوں کا ترجمہ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ اس تمثیل کی خوبی کی ضامن ہیں۔ طباعت و کتابت کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ قیمت چھ آنے ہے۔

نغمہ ربانی جناب ضیاء القادری برائیونی نے ولادت رسول و معراج کے حالات نظم میں پیش کئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے جو رسالہ کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ عثمانی پرس برائیوں ہے۔

نذر دکن خواتین دکن کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جن کا تعلق صرف دکن سے ہے۔ فی الاصل یہ رسالہ سب برس کا "خواتین نمبر" ہے جسے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں نظم و نثر کے تمام مضامین کی تعداد ۲۹ ہے جن میں تاریخی، ادبی و اخلاقی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے اس دور نصف میں دکن مدد محنت دونوں برابر کا حصہ لے رہے ہیں اور دور عثمانی کی یہ وہ خصوصیت ہے جسے تاریخ دکن میں زیر حروف سے لکھا جائے گا۔

اس کی قیمت چھ روپے ہے اور ملنے کا پتہ دفتر رسالہ سب برس حیدرآباد۔

سلطان احمد شاہ بہمنی مولوی محمد ظہیر الدین صاحب ام۔ اے کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے سلطنت بہمنیہ کے قیام و استحکام کا ذکر کرنے کے بعد سلطان احمد شاہ کے مفصل حالات اور اس عہد کے تمام اہم واقعات سے بحث کی ہے۔

کتاب نہایت محنت و کاوش سے لکھی ہے اور تاریخ دکن کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ۔ قیمت چھ روپے ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد۔

وداعِ راشد | مولانا راشد الخیری مرحوم کے انتقال کے بعد مارچ ۱۹۳۷ء کے رسالہ عصمت میں ایک مضمون شایع ہوا تھا جس میں مرحوم کی علالت کے واقعات و حالات بیان کئے گئے تھے۔ اب اسی مضمون کو کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ حالات ان کے صاحبزادہ جناب رازق الخیری نے قلمبند کئے تھے اس لئے ان میں وہی سوز و گداز پایا جاتا ہے جو قدرِ تاباپ کے اٹھ جانے پر ایک بیٹے کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ عصمت دہلی۔

عصمت کی کہانی | یہ بھی جناب رازق الخیری کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ رسالہ عصمت کیونکر وجود میں آیا، مولانا راشد الخیری مرحوم نے اس کے کامیاب بنانے میں کیسی غیر معمولی محنت و کاوش سے کام لیا اور اس رسالہ کے ذریعہ سے ملک کی کتنی زبردست خدمت انجام دی گئی۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

گلستانِ خیاطی | رسالہ جوہر نسواں دہلی کا نواں خاص نمبر ہے جس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ خواتین کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت پندرہ روپے اور ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

اندھی دنیا | مجموعہ ہے جناب اختر انصاری کے چند مختصر افسانوں کا جو اس سے قبل ملک کے مختلف رسائل میں شایع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ جناب اختر نظم و نثر دونوں میں اپنا رنگ سب سے علیحدہ رکھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ دورِ حاضر کے لٹریچر میں ان کے افکار خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں ایک خاص معنویت ہوتی ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ایک خاص دلکش ندرت پائی جاتی ہے۔

اشتراکیت کے دورِ حاضر میں مخصوص اصطلاحی رنگ کے افسانے لکھنے کا جو میلان نوجوانوں میں پیدا ہوا ہے اس کی ایک نہایت اچھی مثال یہ مجموعہ ہے۔ اس کے بعض فسانے نگار میں بھی شایع ہو چکے ہیں اور بہت پسند کئے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبہ جہاں نما، اردو بازار، دہلی۔

کسی خط کا جواب نہ دیا جائے گا

اگر جواب کے لئے ٹکٹ موصول نہ ہوئے۔ اس میں اڈیٹر کے مخصوص احباب شامل نہیں ہیں۔ منہر نگار

ہٹلر کا اعلان

اور

شاعر کا جواب

زندگی کا لطف ہے شانہ بہ شانہ، رو بہ رو
دوسروں کے لطف و رحمت پر سوجن کو اعتماد
دعوتِ اخلاق ہو، یا کہ سیاست کا فریب
ہڈیوں کے فرش پر ہوتی ہے سطوت کی نماز
میری محفل گرم رہتی ہے لہو اور آگ سے
پھول کا دیتا ہوں میں دنیا کو تپھر سے جواب
میرے ایوانوں کی زینت، گیس اور بارود سے
تیرے سینہ میں سمودوں کا تباہی کے شرار
آہِ مظلوم، آہِ بیوہ، فریادِ یتیم،
میرے مذہب میں کسی پر رحم کھانا ہے گناہ
خونِ انسانی کی ارزانی ہو اتنی دہر میں
جانتا ہوں میں زمانہ کا مزاج گرم و سرد
دام ہم رنگ زمیں تھا آشیانہ کے قریب

درس امن و آشتی ہے صرف دیوانہ کی ہو
میں بہا دیتا ہوں، اُن کمزور قوموں کا لہو
جانتا ہوں سب کو میں نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
”آمریت“ خونِ انسانی سے کرتی ہے وضو
توڑ ڈالے میں نے اک مدت ہوئی جام و سبو
توپ کے منہ سے کیا کرتا ہوں، اکثر گفتگو
رقص خانوں میں لیں گے، شاہدانِ خود ہر دو
اے نسیمِ باغِ عشرت، دیکھ تو مجھ کو نہ چھو
ایسے نازک دور میں قلمزم بہ قلمزم جو بہ جو
میری محفل کے یہی ہیں مطربانِ خوش گلو
یہ ڈھنڈو را پیٹ دو منزل بہ منزل کو پہ کو
بچھ سکے جس پر مری نخوت کا تخت آرزو
دے نہیں سکتا مجھے کوئی فریب رنگ و بو
آگیا دھوکے میں آخر ایک مرغِ قبلہ رو

اہرمین کی بزم میں تھی مُردنی چھائی ہوئی

دلو لوں نے میرے گرمایا ہے شیطان کا لہو

شاعر کا جواب :-

نخوت بھرے اٹھان سے تیرے مجھے ہو خوف
فرصت ملے تو دل پہ کبھی ہاتھ رکھ کے سوچ
پولینڈ کے تڑپتے ہوئے دل کی دھڑکنیں
تو اپنے زور ہی میں زمیں پر نہ گر پڑے
”برلن“ کو ”وارسا“ کا مقدر اگر ملے،
اسے کاش تو ضمیر کے کانوں سے سن لے

شاید ترے ضمیر کو ہو گا نہ یہ پسند

تاریخ تجھ کو ظالم و جابر اگر لکھے

تعمیر دہریہ نہیں ہوتی ہے آگ سے
ظالم کا جبر و ظلم تو کاغذ کی ناؤ ہے
مرد کی خدائی باطل کا واسطہ
ان فتح مند یوں پہ نہ اترا، آل سوچ
میں ہوں غلام ملک کا شاعر، نہ اس پہ جا
انجام کار ہوتی ہے مظلومیت کی جے
اچھا نہیں ہے کبر کی اتنی بڑھان لے
قدرت کا انتظام بڑا خوفناک ہے
ہندی ہے میرا جام، حجازی ہے اسکی مے

کم گن زکبر و ناز کہ دیدار است روزگار

چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

(حافظ)

ماہر القادری

لے وقت

ایجنٹوں کو معلوم ہونا چاہیے

کہ نظیر نمبر، سابقہ خاص نمبروں کی طرح پھر کسی قیمت پر نہ مل سکے گا، اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ جتنے پرچے طلب کریں گے اتنا ہی زیادہ فائدہ ان کو ہو گا۔
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ - کمیشن ۲۵ فی صدی، مصارف ڈاک ہمارے فرمے ہوں گے۔

مینجر منگل لکھنؤ

معصیت کدہ فردوس

آسماں کے پار اک دنیا ہے ارمانوں بھری
اُس جگہ ہر طرح کا حاصل ہے رعوں کو نشاط
حسن کی رنگین کلیاں مسکراتی ہیں وہاں
اُن فضاؤں میں کسی کو موت آسکتی نہیں
موج کوثر میں دکتے ہیں ستارے نور کے
نور کے سائے درختاں ہیں نظر کے سامنے
جا بجا چشمے محبت کے چھلکتے ہیں جہاں
ذره ذره اُس جہاں کا میکدہ بردوش ہے
سُرخ ہونٹوں پر تبسمِ رقص کرتا ہے جہاں
وہ مسلسل تہقُّبے، وہ نعمتہائے سرمدی
آتشیں شہر، سراپا آرزو کی شباب
وہ شرابِ حسن کی پرکیٹ نگہت ہائے ہائے
سلسبیل و کوثر و تسنیم کی نہریں رواں
یہ اگر سچ ہے تو ہے فردوسِ معصیت کدہ

ہے میسر جس جگہ عیش و شبابِ زندگی
اُس جگہ چلتی ہے ہر ساعت نسیمِ انبساط
ایک ایک ذرہ کو حاصل ہے سرورِ جاوداں
آتشِ فرقت وہاں دل کو جلا سکتی نہیں
ہر گھڑی دہرائے جاتے ہیں فسانے طور کے
چاند تارے رقص کرتے ہیں نظر کے سامنے
کیفِ نظارہ سے آنکھیں مست رہتی ہیں وہاں
حسن کی رنگین دنیا جامِ در آغوش ہے
رنگ و بو کا قافلہ آکر ٹھہرتا ہے جہاں
وہ نظارہ، وہ فروغِ حسن، وہ جلوہ گرہی،
شرنگیں نظریں نظرِ افروز، جلوے کا میناب
وہ سرتِ خیز رنگینیِ الفت ہائے ہائے
ہر طرف گلگشتِ فراتے، حسینانِ جواں
فحش و بدستی کی دنیا اور گناہوں کی جگہ

جتنی باتیں ہیں بُری یعنی زمین کے فرش پر
وہ سب اچھی ہیں فرازِ چرخ و بامِ عرش پر!

غزل:

بڑھ گئی راحت سے راحت کی تمنا اور بھی،
 دردِ غمخواری سے ہو جاتا ہے دونا اور بھی
 خونِ دل کچھ اس طرح اُن کے اشاروں پر ہوا
 یا تو ہے داناں ساحل یا ہے پھر قعرِ حبیب
 اب ہوئی آزاد روحِ عشق اب ٹوٹا قفس
 نغمہ و رخسار و گل ہی میں نہیں محدود حسن
 کیوں دل افسردہ آج آتا ہے راحت کا خیال
 خونِ دل ہونے کو سمجھے ایک حساں اُن کے سر
 پر سش آزر دگانِ غم کی قدرت بھی نہیں
 جس نے ذوقِ معصیت سے آشنا مجھ کو کیا
 دیکھ کر خارِ بیاباں کی فراوانی جگر
 جوش پر آتا ہے پائے دشتِ پیمیا اور بھی

جگر بریلوی

جنوری ۱۹۴۰ء کے "نگار" کی خصوصیات

- (۱) اس میں نظیر اکبر آبادی کا وہی کلام دیا جائے گا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔
- (۲) اس کے غیر مطبوعہ دیوانِ غزلیات کا بھی انتخاب ہوگا اور غیر مطبوعہ نظموں کا بھی۔
- (۳) اس کے غیر مطبوعہ فارسی کلامِ نظم و نثر پر بھی معہ انتخاب کلام تبصرہ کیا جائے گا۔

منیجر نگار

مکتبہ خجندیہ

نیاز فختوری کی دیگر تصانیف

فلاسفہ و قدیم

ترغیبات جنسی (۱) شہوانیات اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و سیاقی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کی گئی ہے۔ اس کتاب میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ قیمت تین روپیہ (۳) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔	مجموعہ استفسار جوابیہ سہ جلد ان تینوں جلدوں میں ۳۲۷ سے لیکر ۳۳۷ تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار یہ کیا رہے کہ یہ مجموعہ ہر ایک اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم۔	جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲) خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم	فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں خیریت نماز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔ ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ ۲۔ مادیوں کا جذبہ۔ ۳۔ حرکت کے کرشمے۔ نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم
شاعر کا انجام جناب نیاز کے عقائد و مشاہدات کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں نمودار ہیں۔ یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ قیمت دس آنے (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو آنہ (۲) کم	فراست الید مولفہ نیاز فختوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی پاکتہ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم	مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲) علاوہ محصول خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم	گہوارہ تمدن یہ وہ معرکہ الہا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت دو روپیہ (۲) علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اس کے ۱۱۰۴



HEALTH & VITALITY

BEST TONIC
for
BRAIN & NERVES

انتحسان

من کامیابی یا ناکامیابی کا دار و مدار

دماغ

کے فعل پر ہے اور دماغ اسی حالت میں کام کر سکتا ہے
جیکہ جسم میں انفرانش خون ہو اور دماغ کو پوری خوراک مل سکے
قہمی خون

کے بعض عورتاں نسیان میں مبتلا ہوجاتے ہیں اگر آپ ایسی عورت گند رہے ہیں تو

طیبی دواخانہ کی تیار کردہ

شاهی

اسے مال کیے تو آپ زیادہ سے زیادہ محنت کر لے پر بھی دماغ تازہ یا ٹینگے کیونکہ شاهی معده و مگر
نوت و رکیزت خون صالح پیدا کرنی دکان طوبہ دماغ اور اعصابک غذا پہنچاتی ہے قیمت فی شیشی دو روپیہ
مزید معلومات کے لئے فہرست مفت طلب کیجئے

طیبی دواخانہ یونانی

چوک بازار - اندور - ۹۶ محمد علی اور علی علی

TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE BOMBAY

طیبی دواخانہ کی تیار کردہ شاهی معده و مگر